بیٹھک

ڈاکٹر عدیل احمد



بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیٹھک

(افسانے)

ڈاکٹر عدیل احمد

اہتمام

علم و عرفان پبلشرز

40۔ الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7352332-7232336

نام کتاب .... بیٹھک

مصنف .... ڈاکٹر عدیل احمد

ای میل ایڈریس .... drfarooqadeel@gmail.com

اہتمام .... علم و عرفان پبلشرز، لاہور

مطبع .... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ .... اویس احمد

سن اشاعت .... فروری 2016ء

قیمت .... -/250 روپے

ملنے کا پتہ

علم و عرفان پبلشرز

40۔ الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7352332-7232336

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرماویں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

امید اور محبت کے ان
فرشتوں کے نام
جنہوں نے میری زندگی
میں اجالا کیئے رکھا

☆......☆......☆

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے

☆......☆......☆

"I wish that my stories are read but I love my sentences to be enjoyed."

فہرست




حرفِ گریزاں

''یہ زندگی تو پڑھنے کے لئے ہی کم ہے۔''اس نے جھنجھلاہٹ سے سوچا۔''کہاں یہ کہ اس پہ لکھنے کی ذمہ داری بھی اٹھالی جائے۔''

اور پھر اس کے لکھنے سے کیا فرق پڑ جائیگا؟

''یا یوں کہیے کہ میرے نہ لکھنے سے کیا کمی رہ جائے گی؟''اس نے ایک بار پھر قلم رکھ دیا۔کون سا موضوع ہے جس پر لکھا نہیں گیا ہے،لوگوں نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔اور کیسا کیسا خوبصورت لکھا ہے۔اس نے ''اے سانگ آف آئیس اینڈ فائر'' کی تیسری کتاب کھول لی۔اس دنیا کے باسیوں نے کیسی کیسی دنیائیں تخلیق کی ہیں۔جذبوں کی ست رنگی تصویریں،انسان کی ہمت اور استعداد کے خاکے، جنگ و جبر کے نقشے،شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی،تصوراتی جہانوں کے منظر۔کیا کیا جگمگاتی تحریریں ہیں جنھوں نے یہاں سے وہاں تک علم و ادب کا ایک عالم روشن کر رکھا ہے۔پھر کیا ضرور ہے کہ وہ بھی لکھے۔کیا وہ کبھی قرۃ العین حیدر جیسی زندگی سے دھڑکتی ہوئی تحریر لکھ سکتا ہے؟یا ٹولکین جیسی سادا اور مکمل۔پھر الفاظ کی دنیا میں اظہار کے وہ کون سے پہلو ہیں جو اپنی یافت کے لئے اس کے قلم کے منتظر ہیں؟

''اور یہ الفاظ کا گورکھ دھندا بھی خوب ہے۔۔۔!''اس نے سوچا۔''اس کے تانے بانے جتنے مضبوط ہیں اتنے ہی کمزور بھی ہیں۔آواز سے الفاظ تک کا شاندار اور طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی یہ کمزور کمند جذبوں کی فصیل کی بلندیوں سے بہت نیچے کہیں کالے پتھروں میں پھنسی رہ جاتی ہے۔احساس کے ہر اندھے کنوئیں میں جھولتا یہ رسہ وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں سے کنوئیں کی گھٹا ٹوپ تاریکی شروع ہوتی ہے۔ان الفاظ کی گرفت میں،ان کی پہنچ میں تو کچھ بھی نہیں۔محبت،قربانی،انتقام،انتظار،غم اور خوشی،یہ تو ان میوزیمز کے نیون سائین ہیں۔ان میوزیمز میں کیا کیا عجائبات ہیں،لفظ شاید کبھی نہ جان سکیں۔الفاظ تو ان حیرت کدوں کے برآمدوں میں ہی اونگھتے رہ جاتے ہیں اور اظہار و بیان کے سب پیرائے تو ان کی راہداریوں میں ہی بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

لیکن ادب برائے ادب ہوتا ہی کب ہے؟یا برائے زندگی۔یہ تو بس لکھنے والے کے لئے ہوتا ہے۔''اور پھر یہ اس کی ذمہ داری نہیں بلکہ شاید ضرورت تھی۔اسے تو اپنی تشفی کے لئے لکھنا ہے۔ان کنوؤں میں خود جھانکنا ہے،اور کچھ اور کنوئیں،شاید کھودنا بھی ہیں۔ایک بار وہ سب کچھ لکھ دے،وہ سب کچھ جو اس کی انگلیوں میں پارے کی طرح سنسناتا ہے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا پہرہ دیتا ہے،تو شاید وہ دوبارا مسکرا سکے۔ایک پرسکون نیند سو سکے۔گہری اور پرسکون!

وہ جب ناشتے کے بعد کی چائے کا مزہ منہ میں لئے باہر صحن میں آ کر بیٹھا تھا تو دھوپ ابھی درختوں سے اتر رہی تھی۔اس نے پچھلی رات یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح لکھنا شروع کر دے گا چاہے ایک صفحہ ہی لکھے۔ یا ایک جملہ ہی۔اسی لئے وہ اپنے ساتھ کاغذ اور قلم لے کر آیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ ناول بھی اٹھا لایا تھا۔اور اپنے ماہانہ حساب کتاب کی نوٹ بک بھی۔۔۔اور نیل کٹر بھی۔ چنانچہ اس نے کبھی ٹہل کے، کبھی لیٹ کے اور کبھی بیٹھ کے صبح کے تمام درود و وظائف مکمل کئے تھے، ناخن تراشے تھے اور کئی صفحے ناول کے بھی پڑھے تھے لیکن ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔اس نے کئی بار کوشش کی تھی۔قلم کھولا، کاغذ بچھایا۔لیکن کوئی بات نہ اتری۔نہ ذہن سے نوک قلم پہ اور نہ قلم سے قرطاس پہ۔اسے وہ سب منظر یاد آئے جو اس نے کہیں پڑھے تھے یا فلموں میں دیکھے تھے۔جب ایک لکھنے والا ہزار خالی الذہنی کے باوجود اگر کاغذ قلم سنبھالتا ہے یا ٹائپ رائیٹر کے آگے بیٹھتا ہے تو کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس تحریر میں سے کہانی جھانکنے لگتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔شاید اس لئے کہ وہ خالی الذہن نہیں تھا۔اس کا دماغ تو اس ڈبے کی طرح تھا جس میں گھر کی عورتیں سوئی دھاگا، کاج بٹن، پیچ، ہک، ٹوٹی ہوئی تسبیحوں کے دانے، انگوٹھیوں سے نکلے ہوئے نگینے، اور اس قبیل کی بہت سی چیزیں رکھتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی بھی ضرورت پڑ جائے تو سارا ڈبہ الٹنا پڑتا ہے۔وہاں تو اتنا بہت کچھ تھا۔کتنے ہیرے موتی، بھرتے ہوئے گھاؤ، کتنی خراشوں کے کھرنڈ، کیسے کیسے لہجوں کی کھنک اور کس کس یاد کی مہک موجود تھی وہاں۔وہاں تو حسن کے سیپ تھے اور محبت کے جواہر۔اور یہ سب کچھ آپس میں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ ایک سے دوسرے کو الگ کرنا مشکل تھا۔بہت مشکل۔اور تکلیف اسے اور مشکل بناتی تھی۔

''بلکہ ناممکن!''اس نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دھوپ اب اس کے پورے جسم پہ پڑ رہی تھی۔اس نے اپنے دونوں پاؤں اپنے سامنے پڑی خالی کرسی پہ رکھے اور دھوپ کی اس حیات بخش تمازت کو اپنے روئیں روئیں میں جذب ہوتے ہوئے محسوس کیا۔''کاش میرا ذہن بھی ایسا ہی پرسکون ہوتا۔''یہ خیال آتے ہی اس نے اللہ سے توبہ کی اور ان نعمتوں کو یاد کیا جو اس کو میسر تھیں۔''یا اللہ مجھے معاف کر دے، میرا مقصد ناشکری نہیں ہے، اور نہ ہی میں کوئی شکوہ کر رہا ہوں۔لیکن تکلیف تو ہے، ہر وقت کی۔لکھنے تو بالکل ہی نہیں دیتی۔اور نہ لکھوں تو کیا کروں؟''وہ کوئی موسیقار ہوتا تو اپنا یہ دکھ کسی تان کے سپرد کر دیتا، مصور ہوتا تو رنگوں میں سمو دیتا۔لیکن اسے تو بس لکھنا ہی آتا تھا۔اور وہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

اسے یاد آیا اس نے اپنی پہلی کہانی تب لکھی تھی جب بچے ابھی صرف کہانیاں سن رہے ہوتے ہیں۔بیگماں ان کے گھر کام کرتی تھی اور اس کی دو لڑکیاں شاہدہ اور زاہدہ بھی۔شاہدہ بڑی تھی اور زاہدہ چھوٹی لیکن انکی ماں جب بھی ان میں سے کسی کو پکارتی تھی تو نام کے ساتھ ''وڈی'' یا ''چھوٹی'' ضرور لگاتی تھی۔شاید ناموں کے صوتی تاثر کے ایک جیسا ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے ابہام کے تدارک کے لئے۔یہ کہانی اسے اور اس کے دونوں بھائی بہن کو شاہدہ نے سنائی تھی۔اسے اب وہ کہانی تو یاد نہیں تھی لیکن یہ ضرور یاد تھا کہ وہ تھی بہت مزے کی۔اسے وہ پیکیجز کی نوٹ بک بھی یاد تھی جس پر بعد میں اس نے وہ کہانی لکھ لی تھی۔ان دنوں وہ جہلم میں ایک تین کمروں کے

کرایے کے مکان میں رہتے تھے۔ان میں سے ایک کمرہ تو مالک مکان کے قبضے میں تھا جس میں اس نے اپنا سامان بند کر رکھا تھا۔ایک اور چھوٹے کمرے میں انہوں نے سٹور بنا رکھا تھا۔باقی کا ایک بڑا کمرہ بچا تھا جس میں ان کے سونے کے لئے چار پائیاں بھی بچھتی تھیں اور آئے گئے کے لئے ایک صوفہ سیٹ بھی رکھا تھا۔اسی کمرے میں ٹی وی بھی تھا، کتابوں کا ایک ریک بھی اور کپڑوں کی الماری بھی۔وہ کمرہ ان کا سارا گھر تھا۔سوائے باورچیخانے اور غسلخانے کے۔ان دنوں اس مختصر سے خاندان کو جتنا قریب رہنے کا موقع ملا تھا پھر کبھی نہیں ملا۔اسی کمرے میں سردیوں کی ایک شام انہوں نے انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر چلغوزے چھیلتے ہوئے وہ کہانی سنی تھی جواب اسے یاد نہیں تھی۔پھر اس نے ایک کہانی خود لکھی تھی۔اپنی پہلی طبع زاد کہانی۔وہ بچوں کے ایک رسالے میں چھپ گئی تھی اور وہ اعزازی شمارہ ڈاک کے ذریعے اس کے گھر آیا تھا۔وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کہانی لکھنے کی خوشی زیادہ بڑی تھی یا اسے رسالے میں چھپا دیکھنے کی۔اس کے بعد اس نے کئی کہانیاں لکھیں۔بچپن میں بھی اور بعد میں بھی۔

''چائے پیئں گے؟'' زہرا نے برآمدے میں سے پوچھا۔

''ہوں۔'' وہ چونک گیا۔''ابھی تو پی ہے ناشتے میں۔''

''ابھی کہاں، ناشتے کو دو گھنٹے ہو گئے۔میں بنا رہی ہوں صفیہ پھپھو کے لئے۔پینی ہے تو بتا دیں۔''

''اچھا تھوڑی سی دے دینا۔'' اس نے ہاتھ سے اشارا کیا، بالکل جیسے تہذیب بیگم کیا کرتی تھیں۔

''اتنی دیر آپ کنو کھالیں۔'' زہرا ایک پلیٹ میں کچھ کنو لئے باہر آئی۔

''نہیں بھئی میں کچھ نہیں کھا رہا۔'' اس نے حسب عادت کہا۔حالانکہ اسے پتا تھا کہ سردیوں کی اس کھلی ہوئی دھوپ میں کنو کھانے سے بہتر کوئی اور مصروفیت نہیں ہو سکتی۔خاص طور پہ جب کہ اس طرح کچھ نہ لکھ سکنے کے احساس سے بھی کچھ دیر کو چھٹکارہ مل رہا ہو۔پتا نہیں زہرا کو کیسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔یہ بیس سالہ رفاقت کا نتیجہ تھا یا پھر خالہ بھانجی میں جینز کا اشتراک۔تہذیب بیگم اور زہرا میں اور بھی کئی باتیں ایک جیسی تھیں۔یا وقت کے ساتھ ساتھ ایک جیسی ہوتی جا رہی تھیں۔خاص طور پہ تہذیب بیگم کے چلے جانے کے بعد۔۔۔

''مر جانے کے بعد۔'' ہاں ان کے مر جانے کو تسلیم کر لینا اتنا مشکل نہیں تھا جب کہ ایک سال اور پانچ ماہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بستر پہ پڑی رہی ہوں۔اس کے لئے تو وہ جیسے دو بار مری تھیں۔پہلی بار جس رات ان پہ فالج کا حملہ ہوا اور دوسری بار جب وہ بالکل ہی مر گئیں۔لیکن موت کا لفظ ان کے ساتھ لگا نہیں پاتا تھا۔''لیکن پھر فواد۔؟''

''نہیں بھئی نہیں۔ابھی یہ ذکر نہیں۔نہ امی کا، نہ فواد کا۔'' اس نے جلدی سے سر جھٹکا۔جیسے یہ خیال اس کے ذہن سے نہیں بلکہ سر سے چپکا ہوا ہے اور اس طرح سر جھٹکنے سے وہ اسے اتار پھینکے گا۔شاید وقت کا مرہم کبھی یہ اثر دکھا سکے کہ وہ اپنی ایثار نفس مزدور ماں کا اور اپنے ہیرو بھائی کا ذکر کرنے کے قابل ہو جائے۔تکلیف کے ساتھ ہی سہی۔لیکن ابھی نہیں۔''ابو کیسے صدیق چچا کے مرنے کے بعد ہنس

ہنس کران کے قصے سنالیا کرتے تھے!''

اسے سیدھا ماتھا، ستواں ناک اور غالب کے لئے محبت کی حد تک پسندیدگی قاضی مشتاق احمد سے ورثے میں ملی تھی۔ لیکن ان جیسا حوصلہ نہیں پایا تھا اس نے۔ قاضی صاحب پیشے کے اعتبار سے وکیل اور مزاجاً شاعر تھے۔ انہوں نے ذوق صوفیوں کا پایا تھا اور حوصلہ کھلاڑیوں جیسا۔ لیکن شاید جہد مسلسل ان کی شخصیت کی تمام جہتوں کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ انہوں نے کمائی بڑی محنت سے کی لیکن کمائی کے لئے کبھی استعداد سے بڑھ کر محنت نہیں کی۔ وہ کوئی بہت کامیاب وکیل نہیں تھے کہ مقدمات کی بھرمار ہوتی اور موکل وقت مانگتے پھرتے، لیکن وہ ایک بہت قابل قانون دان ضرور تھے کہ بہت سے مصروف وکیل بھی جب کسی قانونی نکتے میں الجھتے تو ان سے مشورہ کر لیتے تھے۔ یوں بھی ان کا ذہن بہت اچھا تھا۔ وہ میٹرک میں آیا تو اس کی سب کتابیں، خاص طور پہ سائنس کے مضامین انہوں نے ناولوں کی طرح پڑھ ڈالے تھے۔ ریاضی سمیت۔ اور پھر ان سے متعلق اسے جو بھی مشکلات پیش آئیں، قاضی صاحب کو اسے ان کا حل سمجھانے میں کبھی دقت نہیں ہوئی۔ اگر کوئی حسابی سوال، فزکس کی کوئی مساوات یا کیمسٹری کا فارمولا پھنس بھی جاتا تو وہ جب تک اسے سلجھا نہ لیتے، ان کا دھیان وہیں اٹکا رہتا۔ اس کے لئے انہیں عام طور پہ کسی کاغذ، پنسل یا کیلکولیٹر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پتا نہیں کیسے انکے ذہن کا ایک گوشہ سارے اعداد و شمار بچھائے حساب کتاب کرتا رہتا تھا اور باقی سب کام بھی وہ ہوش و حواس کے ساتھ انجام دیتے رہتے تھے۔

اسے احساس ہوا کہ قاضی صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے سر نہیں جھٹکنا پڑتا۔ نہ ہی اس کے دماغ میں مسلسل ''نہیں، نہیں'' کی تکرار ہوتی ہے۔ ''لیکن انہیں گئے بھی تو اب کتنے سال ہو گئے۔'' شاید وقت بہرحال اپنا کام کرتا ہے۔

دھوپ کی تمازت اب برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے پیروں کی کرسیاں کھسکا کر امرود کے سائے میں کر لیں۔ یہ پیڑ بھی، اس گھر کے لان میں لگے کئی اور درختوں اور پودوں کی طرح تہذیب بیگم نے لگایا تھا۔ انہیں باغبانی کا بہت شوق تھا۔ گل بوٹے جیسے ان سے بات کرتے تھے۔ پھر جب کچھ برس قبل اس نے کمیٹیاں ڈال ڈال کر گھر کی تعمیر نو کروائی تھی اور لان کی بھی کچھ شکل نکلی تھی تو زہرا نے ان درختوں کی ترتیب ٹھیک کروائی تھی جس کے لئے کچھ درخت کٹوانے بھی پڑے تھے، اور بہت سے آرائشی پودے بھی لگوائے تھے۔ یوں تہذیب بیگم کو کسی درخت کی ایک ٹہنی کا کٹنا بھی گوارا نہیں تھا لیکن اپنی بھانجی کی خوشی کی خاطر وہ چپ رہیں۔ ''ابو کے مرنے کے بعد ویسے بھی وہ خود کو بہت کمزور سمجھنے لگی تھیں۔'' اس نے تکلیف کے ساتھ سوچا۔ اور تیزی سے سر جھٹکا۔ ''اونہوں۔ ابھی نہیں۔۔ اور فواد ۔۔ بالکل بھی نہیں۔''

وہ کیسے لکھ سکتا ہے ایک ایسی دنیا کے بارے میں جہاں فواد نہ ہو۔ ایسی دنیا میں جینا ہی کافی نہیں ہے کیا؟

 

اجنبی

عصر کے بعد کی چائے کے انتظار میں، میں لاؤنج میں بچھے دیوان پہ لیٹ گیا تھا۔ خالہ جان کے گھر میں عید کی چہل پہل اسکے تیسرے دن بھی باقی تھی۔ اور عید پر ہی کیا موقوف، یہ گھر تو ہمیشہ ہی ضرورت سے بڑھ کر آباد رہا ہے۔ گھر کے اپنے افراد سے زیادہ نوکر ہیں یہاں، اور پھر مہمان! نوکروں کے اور مہمانوں کے کئی درجے ہیں۔ اگر صرف اول الذکر ہی کی بات کی جائے تو ان میں دور دراز کے دیہاتوں سے آ کر یہیں رہ کر خدمت کرنے والی کم عمر لڑکیاں بھی ہیں اور جز وقتی کام کرنے والی قریب کے علاقوں سے آنے والی کچھ مائیں بھی۔ پھر ڈرائیور اور مالی جو اس فوج کا مردانہ حصہ تشکیل دیتے ہیں اور اپنے مقرر شدہ کام کے علاوہ سودا سلف لانے، بل بھرنے اور گیرج اور پورچ کی صفائی کرنے کی ذمہ داری بھی پوری کرتے ہیں۔

غیور بھائی کی مہذب، دھیمی لیکن صاف سنائی دینے والی مسلسل آواز تھکے ہوئے اعصاب کے لئے لوری کا سا کام کر رہی تھی۔ میں چائے پینے کے بعد دیوان پہ پیچھے کھسکنے، دیوار سے ٹیک لگانے اور نیم دراز ہونے کے مرحلوں سے گزرتا ہوا اب دوبارہ باقاعدہ لیٹ چکا تھا اور سونے ہی والا تھا جب میری اونگھتی ہوئی سماعت سے ''صاحبِ حال'' کا لفظ ٹکرایا۔ غیور بھائی کی زبان سے تصوف کی یہ اصطلاح مجھے اتنی عجیب لگی کہ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میری غنودگی کے اس وقفے میں محفل پوری طرح سج چکی تھی۔ نومی سراپا شوق بنا، آگے کی طرف جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اسکا یہ انداز اسکی دلچسپی سے زیادہ اسکی تواضع کے باعث تھا۔ اپنے مہمان کی گفتگو میں پورے انہماک کا اظہار میز بانی کے ان آداب میں شامل تھا جو نومی کی شخصیت کا ایک بہت نمایاں پہلو بناتے تھے۔ یوں غیور بھائی اور انکے بڑے بیٹے خرم کی خاطر مدارات انکے آتے ہی بے وقت کی بریانی اور اسکے فوراً بعد ایک پر تکلف چائے کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ وہ ایسے وقت میں آئے تھے جب سہ پہر کی چائے بننے والی تھی لیکن جب ان سے کھانے کے لیے پوچھا گیا اور پھر اس پہ اصرار بھی کیا گیا تو انہوں نے، جیسے کہ سمجھدار آدمی وہ تھے، تکرار میں پڑنے کی بجائے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے تھے اور خالہ جان اور نومی کو بار بار اور باری باری یہ سمجھانے پہ کہ وہ گھر سے کھانا کھا کے چلے تھے، بریانی کھانے کو ترجیح دی تھی۔ خیر جیسی بریانی خالہ جان کے ہاں بنتی ہے، یہ ترجیح دی بھی جانی چاہئے تھی۔

عمران صاحب اپنے مخصوص اندازِ نشست کے ساتھ سب سے زیادہ آرام دہ صوفے پہ سب سے زیادہ غیر آرام دہ طریقے سے براجمان تھے۔ ان کو بیٹھے دیکھ کر، اگر اسے بیٹھنا کہا جا سکے تو، ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ جیسے وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی قدرتی شکل سے مطمئن نہیں ہیں اور اسے کوئی مختلف کرو (curve) دینا چاہتے ہیں۔ ان کے سر اور گردن کی پشت اور گردن سے نیچے کا کچھ حصہ، صوفے پر وہاں

ٹیک لگائے ہوئے تھا جہاں عام طور پر کمر کا درمیانی حصہ ہونا چاہئے۔ کولہے نشست کے بالکل کنارے پہ ٹکے ہوئے تھے اور جیسے وہاں سے بھی پھسلتے ہوئے برخواست ہونے کو تھے، اور باقی کی ساری کمر ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک قوس بنا رہی تھی جو کہیں صوفے کے ساتھ مس کر رہی تھی تو کہیں نہیں۔

سعیدہ خالہ بھی موجود تھیں اور اپنے بیٹے کی گفتگو کا ایک ایک لفظ مکمل بے دھیانی سے سن رہی تھیں۔ یہ بے دھیانی کچھ ایسی مصنوعی بھی نہیں تھی۔ جوڑوں کے درد اور بڑھاپے میں لاحق ہو جانے والی جانے کن کن بیماریوں کے لیے جو طرح طرح کی دیسی اور پردیسی دوائیں وہ پچھلے چند سالوں سے لے رہی تھیں، انکے ضمنی اثرات انکی سماعت، یادداشت اور دھیان سب ہی پر پڑے تھے۔ کئی اہم باتیں اور خاص واقعات وہ بار بار بھول جاتی تھیں۔ اکثر اپنے ماحول اور وقت سے بالکل لاتعلق ہو جاتی تھیں، مکرر کہے بغیر مشکل ہی سے کچھ سنتی تھیں، ہاں، نہ سننے کی بات ضرور اچک لیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ غیور بھائی کی کچھ ایسی باتوں پر جو وہ سن پائی تھیں اور کچھ ایسی باتوں پر جو انہوں نے فرض کر لیں تھیں کہ غیور بھائی نے کہی ہیں، مسلسل تبصرے کر رہی تھیں۔ ان کے ان تبصروں پہ سب سے زیادہ توجہ انیس ماموں دے رہے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں نے اس محفل میں ایک چھوٹی سی محفل الگ سجا رکھی تھی۔ غیور بھائی اپنی ماں اور ماموں کی اس مسکوٹ سے کچھ پریشان نہیں تھے اور جہاں مناسب سمجھتے تھے اپنی گفتگو میں ان تبصروں پر وضاحتوں کے ٹانکے بھی لگاتے جاتے تھے۔

اس نوک جھونک سے سبھی مزہ لے رہے تھے لیکن پورا لطف علی اٹھا رہا تھا۔ وہ کبھی سعیدہ خالہ کے کندھے دبا کر، کبھی ان سے لپٹ کر انکی مسلسل حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ علی کم ہی کبھی کسی محفل میں اتنی توجہ اور حضوری کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ ورنہ اسکی جسمانی موجودگی بھی قسطوں میں ہوتی ہے، کچھ دیر بیٹھا، پھر گھر کے کسی اور کمرے کا چکر لگا لیا، لان میں سے گھوم آیا، فریج میں سے کچھ نکال کر کھا لیا، اور پھر کچھ دیر کے لیے آ گیا۔ دماغی حاضری اس سے بھی کم ہوتی ہے۔ موضوع سے متعلق گفتگو میں اسکا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے سیاست، مذہب، کھیل ادب۔ کسی بھی رائج موضوع پر بات کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن آج کی نشست سے وہ پورا مزہ لے رہا تھا۔ آج اسکا دھیان نہ تو نال لگا کر لان کو پانی دینے میں تھا اور نہ ہی اپنی فرشتوں کی سی خوبصورت بیٹیوں زینب اور زہرا میں۔ خالہ جان اور چچی باورچیخانے میں مصروف تھیں۔ ہمیشہ کی طرح۔ رات کے کھانے کا بندوبست ہو رہا ہوگا، یا پھر نومی کی کوئی بے وقت فرمائش پوری ہو رہی ہوگی۔

خالہ جان وقفے وقفے سے آ کر کچھ دیر کو ہمارے ساتھ بیٹھتی تھیں۔ اسی طرح کے ایک وقفے میں انہوں نے مجھ سے اپنا بلڈ پریشر بھی چیک کروایا۔ یوں تو وہ مومن یا مدیحہ سے کبھی ہفتہ دو ہفتے میں ایک بار یہ خدمت لیتی تھیں لیکن جب کبھی میں موجود ہوں تو براہِ راست ایک ڈاکٹر سے بلڈ پریشر چیک کروانے کا اطمینان ضرور حاصل کرتی تھیں۔ میں نے پارے کے کالم والا بی پی اپریٹس کھولا تو بازو پر لپیٹنے والا کف اس میں نہایت سلیقے سے غلط تہہ کیا رکھا تھا۔

''یہ مومن نے رکھا ہوگا؟''میں نے خالہ جان سے پوچھا۔

''وہی دیکھتا ہے، جب کبھی مجھے چیک کروانا ہوتا ہے۔کیوں ٹھیک نہیں رکھا اس نے؟''

''نہیں،ٹھیک ہے۔میں کئی بار سمجھا چکا ہوں لیکن یہ کف ہمیشہ الٹا ہی تہہ کیا جاتا ہے۔آپس میں جڑ جاتا ہے۔''

''کہتے ہیں یہ والا اپریٹس بالکل درست بی پی بتاتا ہے!''غیور بھائی نے کہا۔

''جی ہاں،اصل میں بلڈ پریشر ناپنے کی اکائی ہی مرکری کے کالم کی اونچائی ہے۔''

''اور یہ ایلیکٹرانک آلے تو اکثر بہت غلط ریڈنگ دیتے ہیں۔''

''اصل میں غیور بھائی وہ بہت سینسی ٹو (sensitive) ہوتے ہیں اور اسی لیے اگر بالکل درست استعمال نہ کیے جائیں تو ایرر (error) آجاتا ہے۔''میں نے سٹیتھو سکوپ کانوں سے لگاتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کو روک دیا۔

''سو،ستر (100/70) ہے۔''بلڈ پریشر دیکھ کے میں نے خالہ جان کو بتایا۔

''تو ٹھیک ہے نا!لو (low) تو نہیں ہے؟''

''نہیں جی بالکل ٹھیک ہے۔''

''پھر رینی ٹیک (Renitec) نہ کھاؤں آج؟''

''جی ضرور کھائیں۔''

خالہ جان کا بلڈ پریشر چیک کرنا ایک سادا سا تنہا عمل نہیں ہوتا۔یہ مرحلہ ایک مکمل کنسل ٹیشن (Consultation) ہوا کرتا ہے۔ہر بار نئے سرے سے۔ان کو یہ سمجھانے کے بعد کہ دوا صرف بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کو ہی کم نہیں کرتی بلکہ بلڈ پریشر کو بڑھنے سے روکتی بھی ہے، میں نے توجہ دوبارا سے غیور بھائی کی جانب مبذول کر دی۔وہ ایک ایسے لڑکے کا قصہ سنا رہے تھے جوان کے یوگا انسٹرکٹر کے گھر میں بن بلایا مہمان بن گیا تھا۔یہ قصہ میری غنودگی کے دوران شروع ہوا تھا اور پھر خالہ جان کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بھی میں اس کا کچھ حصہ سن نہیں پایا تھا۔

''وہ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہا لیکن انہیں کبھی اسکی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں اٹھانا پڑی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک اچھا خاصا ایفیشنٹ (efficient) خدمت گزار مل گیا تھا۔''

''اور وہ بھی انگریز!''علی نے ٹکڑا لگایا۔

''انگریز۔؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔یقیناً میں نے کہانی کے کچھ دلچسپ حصے مس (miss) کئے تھے۔

''ہاں وہ کوئی غیر ملکی تھا۔''غیور بھائی نے بتایا۔''خاور کا خیال تھا کہ وہ جرمن تھا لیکن اب مجھے بالکل یاد نہیں آرہا کہ اس خیال کی

وجہ کیا تھی۔ کیونکہ وہ بولتا وولتا بالکل نہیں تھا۔''

''خاور۔؟ وہی آپکا یوگا انسٹرکٹر؟''

''وہ میرا دوست بھی ہے۔ ایک انوکھا شخص ہے۔ زندگی کو بالکل مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔ اب تو کتنے سال ہو گئے اس سے ملے۔'' غیور بھائی نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا جیسے گزرے ہوئے سالوں کی تعداد کا اندازہ کر رہے ہوں۔ پھر ایک دم سے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اس کہانی کی جیسے ایک نئی ابتدا کی۔

''میں نے اسکی تصویر دیکھی تھی۔ خاور کے البم میں۔ اور اسکی آنکھیں دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ بڑی عجیب آنکھیں تھیں اس کی۔ جیسے کوئی تاثر نہ ہو ان میں۔ لیکن ویرانی نہیں تھی وہاں۔ بلکہ سکون تھا۔

میں جن دنوں رشیا میں پڑھ رہا تھا اور ایک انٹرنیشنل میگزین کے لیے کبھی کبھی فوٹوگرافی بھی کرتا تھا، مجھے پتہ چلا کہ آنکھیں کبھی تاثر سے خالی نہیں ہوتیں، سوائے شاید مردہ لوگوں کے۔ خاور کے البم کے صفحے بے دھیانی میں پلٹتے پلٹتے اس سفید فام لڑکے کی تصویر پر میں رک گیا۔۔۔''

''لیکن غیور بھائی پہلے یہ بتائیں کہ کیا کسی گائے کی آنکھوں میں بھی تاثر ہوتا ہے کوئی؟'' نومی نے پوچھا۔

غیور بھائی نے حسبِ عادت فوراً جواب دینے یا کچھ پوچھنے سے پہلے نومی کی طرف دیکھ کر مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''جب ہم عید سے پہلے قربانی کے لیے گائے دیکھنے گئے تھے تو وہاں ایک گائے پورے پندرہ منٹ تک عمر کو دیکھتی رہی۔'' نومی نے عمر کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور وہ بھی اتنی اداس نظروں سے!'' میں نے کہا۔

''اب دیکھیں نا غیور بھائی، ہم اتنے سارے لوگ گئے تھے۔ عمران بھائی، عدیل بھائی، علی، میں اور سارے بچے، مومن بھی، ٹیپو بھی اور عمر بھی۔ لیکن اس نے صرف عمر کو ہی دیکھا اور دیکھتی ہی چلی گئی۔''

''نہیں عدیل ماموں کو بھی دیکھا تھا۔'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن مجھے تو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ بلکہ اس دیکھنے میں بھی مجھے تو لگا کہ تمہاری طرف ہی اشارہ کیا تھا۔''

''ہوں!'' غیور بھائی اب پوری طرح متوجہ ہوئے۔ ''خاصی انٹرسٹنگ (interesting) صورتحال ہے۔'' انکی آنکھوں کی سنجیدگی سے بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ جیسے وہ عمر کے خلاف اس شرارت میں شریک ہیں۔

''وہ، اصل میں غیور ماموں، سب بچوں نے اسے پیار کیا تھا۔ ہاتھ وات لگایا تھا اسکو۔ بس میں نے نہیں لگایا تھا۔'' عمر نے وضاحت پیش کی۔

’’ہاں بھئی، یہ بات ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے اسے یہ گلہ ہو کہ تم نے اسے پیار کیوں نہیں کیا۔‘‘

’’جی ہاں یہی بات ہوگی، تبھی تو وہ اتنی اداس تھی۔ بلکہ مجھے بھی جو دیکھا تو ایک طرح سے عمر ہی کی شکایت لگائی تھی۔‘‘

عمر جو کئی دن سے اس بات کے بار بار زیرِ بحث آنے سے خاصا پریشان تھا، کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگا۔

’’لیکن مجھے تو اسکی نظریں کچھ ٹھیک نہیں لگیں۔‘‘ نومی کو بات کے اتنی جلدی طے پا جانے سے کچھ خوشی نہیں ہوئی۔

’’ہوسکتا ہے وہ عمر کو اپنا کوئی بچھڑا ہوا بچھڑا سمجھ رہی ہو۔‘‘ مومن نے ٹکڑا لگایا۔ بچے گفتگو کے اس غیر سنجیدہ موڑ سے خوش تھے اور چاہتے تھے کہ بات یہیں گھومتی رہے۔ لیکن مجھے یہ ڈر تھا کہ اس غیر ملکی لڑکے کا تذکرہ کہیں ان بھول بھلیوں میں نہ کھو جائے۔

’’آپ اس لڑکے کی آنکھوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔‘‘

’’بس وہ عجیب سی تھیں۔ ان کنسرنڈ (unconcerned)۔ وہ لڑکا اپنے آس پاس سے بالکل جڑا ہوا نہیں لگتا تھا۔‘‘

’’کوئی ایلین (alien) ہوگا!‘‘ علی نے کہا۔

’’ہاہاہا۔‘‘ غیور بھائی ہنسے۔ ’’ہُم۔ ایلین صرف ایکسٹرا ٹیریسٹرئیل (Extra-terrestrial) نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ رسموں رواجوں سے، سوسائیٹی کے نورمز (norms) سے، اور لگے بندھے قاعدوں سے ایلین ہوتے ہیں۔ خیر میں نے خاور سے پوچھا کہ یہ کون ہے، اس نے مجھے یہ دلچسپ کہانی سنائی۔

کہنے لگا، ایک دن وہ کہیں سے گھر واپس آیا تو یہ لڑکا بھی اس کے ساتھ ہی اندر گھس آیا۔‘‘

’’۔۔۔یعنی ایسے ہی۔۔۔ زبردستی۔۔۔؟‘‘ نومی نے حیرت سے پوچھا۔

’’نہیں، زبردستی بھی نہیں۔۔۔ خاور نے بتایا کہ وہ ایسے آرام سے اتنی تسلی سے اسکے پیچھے پیچھے چلا آیا کہ خاور اسے روک ہی نہ سکا۔ بالکل جیسے وہ بھی گھر ہی کا کوئی فرد ہو۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خاور کو بھی وہ ایسا ہی لگا۔ وہ کہتا ہے مجھے اسے روکنے کا، اس سے کچھ پوچھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ بلکہ نازی نے بھی اسے گھور کر دیکھا تک نہیں کہ بھائی تم ہو کون اور کہاں گھسے چلے آرہے ہو؟ اس دن سے وہ ان کے گھر کا ایک فرد ہی ہو گیا۔ پھر وہ ڈیڑھ سال وہیں رہا۔ جیسے گھر کا کوئی فرد بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اکثر ان میاں بیوی کے کمرے میں ہی سو جاتا تھا۔ وہ دونوں اپنے ایک سال کے بچے کو اس پر چھوڑ کر اپنے اپنے کام پہ نکل جاتے تھے۔۔۔‘‘

’’لیکن ایک اجنبی پر اتنا اعتبار کیسے کیا جاسکتا ہے!‘‘ میں نے کہا۔

’’ایک اجنبی کو اس طرح گھر میں رکھ لینا بڑی عجیب بات ہے۔ اور پھر اتنا اعتبار اور اتنی اپنائیت۔۔۔! یہ واقعی سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ہیں۔ لیکن یہی باتیں اس کہانی کو دلچسپ بناتی ہیں۔ خاور نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکا بہت غیر معمولی تھا۔ اس پر اعتبار کئے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ لیکن جیسے کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ خاور خود بھی ایک عجیب و غریب انسان ہے۔ وہ اور اسکی بیوی دونوں ہی انوکھے ہیں۔

لاکھوں کی نوکریاں چھوڑ کر یوگا سنٹر اور آرٹ سنٹر چلانا بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ خاور ایک اچھی خاصی ملٹی نیشنل اور گنائزیشن میں کام کرتا تھا اور نازی لاکھوں کی کونسل ٹینسیز (Consultancies) دیتی تھی۔ میاں صاحب یوگا سکھانے لگے اور بیوی قریب کی کچی آبادی میں لڑکیوں کو آرٹ کی تعلیم دیتی تھیں۔ یعنی گہما گہمی کے اس پر آشوب دور میں، جہاں ساری دنیا زندگی میں آرام و آسائش اور ترقی حاصل کرنے کے لئے سرپٹ بھاگی چلی جارہی ہے وہاں یہ دونوں فائین آرٹس اور بزنس مینیجمنٹ جیسی مہنگی تعلیم لے کے اپنے اندر کا اطمینان حاصل کرنے کے چکر میں دنیا تیاگے بیٹھے تھے۔''

''ویسے سچی بات تو یہی ہے کہ ترقی کے معانی بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔'' پچھلے دنوں میں نے اپنے ریڈیو پروگرام میں ایک ڈیبیٹ (debate) کروائی۔ موضوع تھا کہ کسی قوم کی ترقی کن حوالوں سے میئر (measure) کی جاسکتی ہے۔ بہت سارے پہلو نکل کے سامنے آئے۔''

''مروجہ طریقہ تو یہی ہے کہ اسکی جی ڈی پی (G D P)، اسکی پر کیپیٹا انکم (Per capita income)، اسکے صحت اور تعلیم کے انڈی کیٹرز (indicators) دیکھے جائیں۔'' نومی نے کہا۔

''یا پھر یہ دیکھا جائے کہ اسکے ادارے کتنے مضبوط ہیں، سسٹمز کتنے فعال ہیں، حکومت میں عوام کی شراکت کس حد تک ہے؟''

''عام طور پر لوگ سڑکوں، عمارتوں، پلوں اور اس طرح کے دوسرے انفراسٹرکچر (infrastructure) سے قوموں کی ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ وہاں کیسی ٹرینیں چلتی ہیں، صفائی کا کیسا زبردست انتظام ہے، شاپنگ مالز (Shopping malls) کیسے عظیم الشان ہیں۔'' علی نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔

''اسکے علاوہ آپ کی فوج ہوتی ہے۔ اسکا سائز، اسکی کپے سیٹی (capacity)، اسکا سکل (skill) یہ سب چیزیں میٹر (matter) کرتی ہیں۔ آپکے پاس ہتھیار کتنے جدید ہیں؟ اپنے پڑوسی ملکوں پہ کتنا انفلوئنس (influence) ہے آپ کا؟''

''جی ہاں، سائنسی فتوحات، ریسرچ اور ایکسپلوریشنز (explorations) بھی ترقی جانچنے کے بڑے پرومینٹ ایسپکٹس (Prominent aspects) ہیں۔'' نومی بولا۔

''اسی طرح کی باتیں اس پروگرام میں بھی ہوئیں۔'' میں نے کہا۔'' میں انتظار کرتا رہا کہ کوئی ترقی کے کچھ اور پہلوؤں کی بات بھی کرے۔ مثلاً ترقی کی ایک جہت یہ بھی ہے، یا ہونی چاہئے کہ لوگ زیادہ تحمل والے، ایک دوسرے کی مدد کرنے والے، مصیبت پر صبر کرنے والے ہوں، عام طور پہ جھوٹ نہ بولتے ہوں، لالچ کی جگہ قناعت ہو ان میں، مہمان نواز، کھلے دل والے، بچوں سے پیار کرنے والے، بڑوں کا احترام کرنے والے ہوں، اپنی قدروں کی حفاظت کرتے ہوں، رشتوں کا لحاظ کرتے ہوں، وعدے کے پکے ہوں۔۔۔''

''یہ تو پھر جنت ہوگئی۔'' علی نے کہا۔

''تو جنت ہی تو انسان کی ترقی اور کمال کی آخری سٹیج ہے، میرا تو خیال ہے کہ جو جو معاشرہ ان اوصاف میں آگے بڑھتا جائیگا، ان پہلوؤں میں ترقی کرتا جائیگا وہ اسی قدر جنت کے نزدیک ہوتا جائیگا۔''

''ہُم!'' غیور بھائی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''اور اسی طرح ہم ایک فرد کی، ایک خاندان کی ترقی کا جائزہ لے سکتے ہیں، ایک مختلف انداز میں۔ عافیت، صبر، توکل، شکر، ایثار۔ "And not necessarily wealth and power"

''ابراہام مازلو کہتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی سیڑھی چڑھ کر ترقی کے بام پر پہنچتا ہے۔ یعنی اسکی بنیادی ضرورتیں سب سے پہلے پوری ہونی چاہئیں۔ زندگی کی بقاء کے لئے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز ہوکر وہ اگلی سیڑھی چڑھتا ہے۔ جہاں وہ غذا کو سٹور کرنا چاہتا ہے، کوئی پناہ گاہ چاہتا ہے، یعنی survival کے بعد safety کی سٹیج ہے۔ یہ مرحلہ بھی اگر طے ہوجائے تو معاشرتی ضرورتیں سجھائی دیتی ہیں۔ بندہ دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ محبت، تعلق، وفاداری، یہ سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ ان Social needs کے پورا ہونے کی بعد باری آتی ہے عزتِ نفس کی۔ Self esteem کی۔ اب انسان اس قابل ہوتا ہے کہ خود آگاہی کی طرف بڑھ سکے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اپنے معاشرے کی ترقی میں contribute کرسکتا ہے۔''

''لیکن زندگی میں اکثر مازلو کی hierarchy ہمیں غلط ثابت ہوتی نظر آتی ہے۔ انبیاء کو، جو اس درجہ بدرجہ ارتقاء کی سب سے بڑی contradiction ہیں، اگر exclude بھی کر دیا جائے، کہ وہ ایک اور منفرد مقام پہ فائز ہوتے ہیں یعنی revelation، پھر بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ابتدائی مراحل کی ضروریات کے پورے ہوئے بغیر Self actualization کی سٹیج پہ پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ کے بہت سے نیک بندے، ریفارمرز، سوشل ورکرز، آرٹسٹ، سائینسدان۔۔ غرض بیشمار مثالیں ہیں۔''

''ہاں تمہارے آرگیومنٹ سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن خاور بہر حال یہ مرحلے طے کر چکا تھا۔'' غیور بھائی نے کہا۔ ''وہ ہمیں یوگا کے لئے اکثر ایسے وقت میں بلاتا تھا جو کاروبار کے لئے پیک آور (Peak hour) کہلاتا ہے۔ اسکے حلقے میں ہم سب کاروباری لوگ تھے۔ میں آرکیٹیکٹ (architect) ہوں تو کسی کا کنسٹرکشن (construction) کا بزنس تھا، کوئی کونسلٹیشن (consultation) دیا کرتا تھا۔ خاور چاہتا تھا ہم ایسے وقت میں دنیا سے کٹ کر دیکھیں جب اس میں الجھنے کا سب سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ خود اپنے آپ کو دریافت کرنے کے لئے یہی سب سے زیادہ مناسب وقت ہوتا ہے۔''

''شاید۔!'' میں نے کہا۔ ''پھر تحمل اور خود پہ قابو بھی حاصل ہوتا ہوگا، لیکن اپنی ملازمت سے تو بددیانتی ہوتی ہوگی نا۔''

''ہم سارے Self employed لوگ تھے۔ ہاں ہمارے clients کو کچھ نہ کچھ زحمت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن کچھ فائدے اس کے ضرور ہوئے۔ اوروں کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن میں نے اس پریکٹس سے اپنے ملازموں کے اوپر اعتماد کرنا سیکھا۔ یہ بھی کہ وہ

دیانتداری سے کام کریں گے اور یہ بھی کہ میری غیر موجودگی میں وہ کلائینٹس کے ساتھ ڈیل (deal) کرنے کے قابل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر کام میں میرے پوری طرح انوالو ہوئے بغیر بھی گزارا ہو جاتا ہے۔''

''یہ کرتے رہیں اعتماد!'' سعیدہ خالہ نے بات اچک لی۔ ''یہ تو ہمیں پتہ ہے کہ وہ ان کے اعتماد کو کس طرح ملیامیٹ کرتے ہیں۔ سارا سارا دن ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اپنے ذاتی فون کرتے رہتے ہیں۔''

غیور بھائی مسکرائے۔ ''امی آپ کو کیا پتہ وہ کون سے فون کر رہے ہیں۔ میرا تو سارا بزنس ہی ٹیلیفون پہ ہوتا ہے۔''

''سرکاری نوکری ملی ہوئی ہے حرامخوروں کو۔ اے سی لگا کر سارا دن کمپیوٹر پر بیٹھے رہتے ہیں اور اگر ذرا سا کام کہہ دو تو جان نکلتی ہے۔ اس دن میں نے اپنے دروازے کے لاک کا کہہ دیا کہ بھیا ذرا دیکھنا بند ہو جائے تو کھلتا نہیں۔ جھٹ سے بولے۔ 'آنٹی یہ تو آپ۔ جانے کیا نام لیا۔ کہ اس کو دکھائیں۔''

''ہاہاہا۔'' غیور بھائی ہنسے۔ ''آپ ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے تالے ٹھیک کروانا چاہیں گی تو اس سے زیادہ جواب کی توقع نہیں کر سکتیں۔''

غیور بھائی نے اپنے ماڈل ٹاؤن والے آبائی گھر کو جب دوبارا سے تعمیر کروایا تھا تو اسی میں اپنا آفس بھی کھول لیا تھا۔ رہائش اور آفس کے حصوں میں اپنی آسانی کی خاطر کوئی باقاعدہ علیحدگی نہیں رکھی تھی اور گھر سے دفتر کا آنا جانا اندر ہی سے تھا۔ گھر میں مستقل تو صرف سعیدہ خالہ ہی رہتی تھیں۔ بھابھی کینیڈا میں سیٹلڈ (settled) تھیں، بچے اپنے سکول کالج کے ہوسٹل میں۔ غیور بھائی بھی کینیڈا پاکستان آتے جاتے رہتے تھے۔ آفس اور گھر اکٹھا ہونے کی وجہ سے ملک سے باہر جاتے ہوئے انہیں ماں کی فکر کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی، ہاں دفتر میں کام کرنے والوں کی فکر اکثر رہتی تھی۔

''اجی ماں کے کمرے میں ایک اے سی اور وہ حرامخور دو، دو اے سی لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے تو ایک دن کہہ دیا۔ میاں یہ ایک اے سی بند کر دیا کرو، کیا نمونیا کرواؤ گے۔''

''ہاہاہا۔'' علی منہ کھول کر ہنسا۔ ''یہ تو ویسے غیور بھائی زیادتی ہے۔ یا تو آپ خالہ جان کو بھی دو اے سی لگوا کے دیں۔''

''یہ تو ایک بھی بند کر دیتی ہیں، دفتر کی فضول خرچی کی تلافی کے طور پر۔''

''کیا کہہ رہا ہے؟'' سعیدہ خالہ نے علی سے پوچھا۔ اب جبکہ وہ ایک مناسب موقعے پر اپنی سماعت کا درست استعمال کر چکی تھیں تو کچھ دیر کچھ نہ سن سکنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

''آفس کا کمرہ بڑا ہے جس میں میں نے لکڑی کے پارٹیشنز (partitions) بنوا لیے ہیں۔ وہاں ایک اے سی سے گزارا نہیں ہوتا۔ میں اپنے دفتر کے لوگوں پر جو بھی خرچ کرتا ہوں وہ ایک پیسے کا بھی زیاں نہیں ہے۔ یہی لوگ تو مجھے کما کر دیتے ہیں۔ پھر جتنے competent لوگ میرے پاس ہیں اور جتنی دیر سے ہیں ایسا بہت کم جگہوں پہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ جب لوگوں پہ اعتماد

کرتے ہیں تو نہ صرف ان کے لئے بلکہ اپنے لئے بھی آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ شک، نگرانی، روک ٹوک، ضابطے۔ یہ سب چیزیں آپ کو بوڑھا کر دیتی ہیں۔ اور بلڈ پریشر، السر، اور شوگر کے تحفے الگ۔''

''اور وہ خاور کا کیا ہوا؟'' علی نے یاد دلایا۔

''وہ کہتا تھا لمحہء موجود میں زندہ رہنا سیکھو۔ ہمارے ہاں تصوف کی ایک اصطلاح ہے، صاحبِ حال، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے لمحہء موجود سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''میں نے کچھ تھوڑا بہت پڑھا ہے تصوف کا فلسفہ۔'' مجھ سے پھر صبر نہ ہو سکا۔ ''صاحبِ حال تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو وقت کا ادراک کر لیتے ہیں، جن پہ حال کھل جاتا ہے۔''

''خاور کی، یا پھر میری definition بھی ایک طرح سے اس مروجہ تعریف کے مطابق ہی ہے۔ ہم سب لوگ کسی بھی کام کے دوران ماضی یا مستقبل میں معلق رہتے ہیں۔ کوئی دکھ، کوئی یاد، پچھتاوا، کوئی رنج، کوئی تجربہ، یا پھر آئندہ کا منصوبہ، خوف، اندیشہ۔ یہی سب کچھ ہر وقت ہمارے دھیان سے چمٹے رہتے ہیں۔ اور حال کے سارے کام عام طور پر ایک روٹین، ایک عادت کے سہارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اب صرف ایک نماز ہی لے لو۔ اپنے رب سے تعلق قائم کرنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جسکی مثال کسی قسم کے گیان یا یوگا کی کسی exercise میں نہیں ملتی۔ لیکن ہم اپنے موجود سے بالکل کٹ کر یہ مرحلہ طے کرتے ہیں۔ اس میں بھی صرف ایک اھدنا الصراط المستقیم ہی لے لو۔ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی مانگتے ہیں لیکن صرف منہ سے، دل کہیں اور ہوتا ہے۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ! یعنی صاحبِ حال کو خشوع وخضوع اور حضوری حاصل ہوتی ہے؟''

''بس صاحبِ حال وہ ہے جو اپنے present میں اپنی پوری پوٹینشل اور اس سے بڑھ کر اپنے پورے دھیان کے ساتھ جیتا ہے۔ مذہب کے ساتھ اسکا تعلق شرط والا نہیں ہے۔''

''جی؟''

''مطلب یہ کہ ضروری نہیں کہ صاحبِ حال کوئی مذہبی بندہ بھی ہو۔''

''یعنی تصوف کے ایک اعلیٰ مقام پہ فائز ہو لیکن ضروری نہیں کہ وہ دل سے پکا مسلمان بھی ہو۔''

''جی ہاں! بلکہ مسلمان ہی نہیں، کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔'' غیور بھائی مسکرائے۔ اب یہ قصہ کچھ کچھ ہم دونوں کے بیچ ایک مکالمہ سا بنتا جا رہا تھا۔ باقی حاضرین کی دلچسپی انکی تعداد کی طرح کم ہوتی جا رہی تھی۔ علی کا تو اتنی دیر تک کہیں بیٹھنا ویسے بھی غیر معمولی بات تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے کمرے میں بستر پہ لیٹا زینب سے اس کے سکول کی باتیں کر رہا تھا۔ بچے بھی اٹھ گئے تھے۔ صرف عمر بیٹھا نومی کے پاؤں دبا رہا تھا۔

''تصوف کو مذہب کے ساتھ کنفیوز نہیں کرنا چاہئے۔'' غیور بھائی نے بات جاری رکھی۔

''یہ کانسیپٹ ہر دور میں اور ہر مذہب میں موجود رہا ہے۔ بلکہ متصوفین کے ایسے cult بھی ہمیشہ رہے ہیں جو اصل میں کسی بھی ریگیولر مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ گیان کے عجیب وغریب مظاہرے، اجتماعی مشاہدے اور کرامات کا ذکر ہر قسم کی مذہبی اور غیر مذہبی صوفی شخصیات کے حوالے سے ملتا ہے۔''

''خیر یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ جس طرح تصوف کو میں سمجھتا ہوں، اسے اخلاص بھی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح لفظ ہے۔ احسان۔''

غیور بھائی نے حسبِ عادت صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ یعنی میں اتفاق کروں یا نہ کروں، تمہاری بات سننا ضرور چاہتا ہوں۔

''یعنی بندے کے عقیدے درست ہوں، اللہ، رسول، کتابوں پر، آخرت پر اور تقدیر پر اسے پکا یقین ہو، تو یہ تو ہو گیا ایمان۔ اب وہ اپنے تمام فرائض بھی پورے کرتا ہو۔ عبادات اور معاملات درست ہوں تو سمجھئے اسلام بھی ٹھیک ہو گیا۔ پھر اگر اللہ کی موجودگی کا، حضوری کا احساس ہر وقت رہے تو یہ احسان ہے، یعنی دین اپنی حسین ترین شکل میں۔''

''یہ آپ حدیثِ جبرائیلؑ کو ہی، میرا خیال ہے کہ explain کر رہے ہیں۔'' نومی نے کہا۔

''بالکل۔''

''جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اہلِ تصوف نے، یا یوں کہو کہ قائلینِ تصوف نے اپنے اس فلسفے کی سند کے لئے جو مختلف سہارے لیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تصوف کو relate کر دیتے ہیں حدیثِ جبرائیلؑ سے، حالانکہ اس دور میں کوئی صوفی، قلندر یا مجذوب نہیں تھا۔ وہ سارے پریکٹیکل لوگ تھے، قرآن کی ایک ایک آیت کو سمجھتے تھے، اس کو internalize کرتے تھے اور پھر آگے چلتے تھے۔ کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو آ کر رسولِ خدا ﷺ سے معافی مانگتے تھے۔ زیادہ تر زندگی انہوں نے جہاد اور جدوجہد کرتے گزار دی۔ اس کے علاوہ اہلِ صفہ سے بھی تصوف کا تعلق جوڑا جاتا ہے۔ پھر دل کی صفائی اور تزکیہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ صوف کے کپڑے چونکہ درویشوں کا لباس ہوتا تھا لہٰذہ تصوف کا تعلق اس لفظ صوف سے جا ملتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کا نشان ہمیں تینوں الوہی مذاہب کے علاوہ ہندومت میں بھی ملتا ہے بلکہ وہ تو اس روحانیت کے تجربوں اور مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک کتاب ہے، تذکرہ غوثیہ، غوث علی شاہ پانی پتی کی Sort of a biography ہے۔ اس میں ہندو یوگیوں اور سنتوں کی کتنی ہی کرامات بیان کی گئی ہیں۔''

''تذکرہ غوثیہ تصوف کی کتابوں میں کوئی Reference book کا درجہ نہیں رکھتی۔''

''درست۔ لیکن آپ کشف المحجوب یا غنیۃ الطالبین بھی پڑھ جائیں۔۔۔''

''اجی حضرت، کیا یہ ممکن نہیں کہ ایسی ادق اور سنجیدہ کتابیں پڑھے بغیر ہم اس غیر ملکی لڑکے کا قصہ پورا سن لیں۔''

''ہاہاہا۔'' غیور بھائی شائستگی سے ہنسے۔''اچھا چلو ہم آپ کی آسانی کے لئے یہ تصوف اور صاحبِ حال کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ کوئی دوسرے لفظ رکھ لیتے ہیں، مثلاً۔۔''

''یہی چلیں گے غیور بھائی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔''صاحبِ حال کے لفظ سے ہی تو میری دلچسپی شروع ہوئی تھی۔تو وہ خاور صاحب، صاحبِ حال تھے یا پھر انکا وہ بن بلایا مہمان؟''

''پتہ نہیں۔لیکن خاور ہمیں 'حال' کی کیفیت سے روشناس ضرور کرنا چاہتا تھا۔اور وہ غیر ملکی لڑکا۔شاید اس کیفیت سے گزر رہا تھا۔خاور بتاتا ہے کہ کبھی کبھی وہ سارا دن ایک پینٹنگ دیکھنے میں گزار دیتا تھا۔وہ کئی کئی گھنٹے خاور کے بچے کے پوتڑے دھوتا رہتا تھا۔''

''تو پڑے۔۔۔'' عمر نے چونک کر پوچھا۔

''تو پڑے نہیں بیٹا، پوتڑے، کپڑے کے پیمپرز۔Re-usable۔وہ کسی صابن یا پاؤڈر کے بغیر صرف ہاتھ سے دھوتا تھا اور ایسے صاف کر دیتا تھا جیسے کبھی گندے ہی نہ ہوئے ہوں۔لیکن اصل چیز اس کی دل جمعی تھی۔اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے اسکی زندگی کا مقصد ہی پوتڑے دھونا ہے۔اسی پر بس نہیں وہ جو بھی کام کرتا تھا اسی دھیان اور محنت سے کرتا تھا۔بظاہر چھوٹے چھوٹے معمولی اور غیر اہم کام ہوتے تھے۔جھاڑو کے ٹوٹے ہوئے تنکوں سے، استعمال شدہ بلیڈوں سے، سٹراز (straws) سے، وہ ایسی ایسی خوبصورت چیزیں بناتا تھا کہ عقل حیران رہ جائے۔ان میں سے کچھ تو خاور نے مجھے دکھائیں بھی۔واقعی کمال کی کاریگری تھی۔''

مغرب کب کی ہو چکی تھی۔گہرا پڑتا ہوا اندھیرا میرے دل میں نماز کے قضا ہو جانے کا خوف پیدا کر رہا تھا۔میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''غیور بھائی بس پانچ منٹ دے دیں مجھے۔میں تین فرض پڑھ آؤں۔''

''نہیں نہیں تم اطمینان سے نماز پڑھو، ہم اب چلیں گے۔کیوں امی، چل رہی ہیں؟'' غیور بھائی نے آخری جملہ قدرے بلند آواز سے اس کمرے کی طرف منہ کر کے کہا جس میں انکی ماں اس گفتگو سے تنگ آ کر کچھ دیر پہلے اپنے بھائی کے ساتھ جا بیٹھی تھیں۔

''لیکن حضرت، یہ کہانی تو مکمل کر دیں۔''

''بس یار، ایسی کچھ قصہ کہانی والی بات نہیں ہے اس میں۔وہ لڑکا تھا کچھ عجیب سا۔کبھی کبھی سردیوں میں ساری ساری رات بغیر کمبل کے گزار دیتا تھا اور کبھی گرمیوں کی بھری دوپہر سورج کے سامنے پڑا رہتا۔باہر کبھی جاتا تو لوگ اسے تحفے میں پھل، سبزیاں، اور مٹھائیاں دے دیتے۔پڑوسی اچھے اچھے کھانے پکا کر دے جاتے۔حالانکہ اس سے پہلے خاور وغیرہ کے کسی پڑوسی سے کوئی مراسم نہیں تھے۔اگر کبھی سودا سلف لینے کے لئے اسے بھیج دیتے تو وہ ہمیشہ بہترین چیز لے کر آتا، اور کم سے کم ریٹ پر۔''

''لوگ غیر ملکی سمجھ کر خاطر تواضع کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہونگے۔''

''لیکن تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ غیر ملکی دیکھ کر تو ہمیشہ ریٹ بڑھا دیے جاتے ہیں۔''

''جی ہاں، یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔''

''ادھر ریلوے ٹریک کے پیچھے جو سڑک جا رہی ہے، میں پھل لینے گیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک بندہ گھڑے بیچ رہا تھا، پانچ پانچ سو میں۔ ایک گورا ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے پوچھا تو بیچنے والے نے پانچ سو سے پانچ ہزار کر دیے۔ باقی لوگوں میں سے کوئی کچھ بولا تو کہنے لگا 'بھائی مہربانی کرو، اسے پسند آ گیا تو اپنی دیہاڑی بن جائیگی۔''

نومی نے اپنا تجربہ سنایا۔

''وہ لڑکا آجکل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' غیور بھائی نے کہا۔ ''خاور وغیرہ جب بھی گھر سے باہر جاتے اسے واپسی کا وقت بتا کر جاتے تھے۔ وہ یا تو گھر پر ٹھہرتا یا ان کے ساتھ ہی نکل جاتا۔ پھر چاہے تو انکے ساتھ ہی رہتا یا پھر اپنے طور پر گھوم گھام لیتا۔ لیکن خاور ہمیشہ اپنے بتائے ہوئے وقت پر پہنچ جاتا اور اس لڑکے کو واپسی پر گھر کھلا ملتا۔ ایک دن یہ لوگ اسی طرح نکلے۔ بچے کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا، وہ لڑکا بھی کہیں نکل گیا۔ خاور وغیرہ مقررہ وقت سے بہت پہلے فارغ ہو گئے۔ نازی نے کچھ کپڑے خریدنے تھے۔ سوچا وہ بھی لیتے چلیں۔ وہاں بہت دیر ہو گئی۔ واپس پہنچے تو سامنے والے پڑوسی نے بتایا کہ وہ لڑکا آیا تھا، دروازے پہ تالا دیکھ کر چلا گیا۔ وہ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔''

غیور بھائی کو چھوڑنے کے لئے ہم باہر نکلے تو علی کا ڈرائیور پورچ کے بلب کی روشنی میں انتہائی تندہی کے ساتھ بالٹی میں پانی لئے گاڑی کے ٹائروں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔

 

اے بسا آرزو

لکشمی سے آتے ہوئے گلستان سینما کے چوک سے بائیں طرف مڑیں تو مکلوڈ روڈ تک پھیلی ہوئی منٹگمری روڈ پہ آٹو سپیل سروس کی ایک دنیا آباد ہے۔ یوں کہنے کو یہ ایک سڑک ہے لیکن گزرگاہ کے طور پر اسکا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ گاڑیوں کے کل پرزوں، نمائشی چیزوں، نشستوں کے غلافوں اور ایسی تمام چیزوں کی دکانیں، اور دکانوں سے زیادہ ان تمام چیزوں سے متعلق ہر قسم کی خدمات مہیا کرنے والے دکان بدوش لوگوں کا ایک ہجوم ہے اس سڑک پر۔ آپ کے سڑک پہ داخل ہوتے ہی کئی لوگ مختلف قسم کی خدمات پیش کرنے کے لئے آپکی گاڑی کے گرد اکٹھے ہو جائینگے۔ وہ آپکو پارکنگ کی مناسب ترین جگہ بھی فراہم کریں گے اور ارزاں ترین نرخوں پر آپ کی گاڑی کی صفائی، پالش، وہیل کپس کی تبدیلی، کئی طرح کے سٹکرز کی فراہمی، مڈفلیپس، وائپرز، سیٹوں کے غلاف، سٹیرنگ کور، فرش۔۔۔ غرض ہر وہ خدمت مہیا کرنے کیلئے تیار ہی نہیں مصر ہونگے جو آخر کار وہ اپنے بتائے ہوئے داموں سے آدھے داموں میں اور اپنے بتائے ہوئے وقت سے دگنے وقت میں بہم پہنچا دیں گے۔

ان کندھے سے کندھا جوڑے کھڑی دکانوں کی صفوں میں کہیں کہیں ذیلی گلیوں کے رخنے بھی ہیں۔ یہ گلیاں مارکیٹ سے پیچھے بسے ہوئے محلوں کو جاتی ہیں اور ان محلوں سے بھی پیچھے مزید کئی چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ اصل میں یہ چھوٹے چھوٹے محلے جنہیں ان سے ملحقہ سڑکوں اور مارکیٹوں کے ناموں کے ساتھ پارک کا اضافہ کر کے نام دے دیے گئے تھے، اپنی بقا کا آخری دور دیکھ رہے ہیں۔ گلیوں میں جہاں کہیں ذرا سی بھی زیادہ جگہ میسر آئی ہے، مرمت اور آرائیش کے لیے گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں، جو محلے داروں کی مستقل ناپسندیدگی اور گاہے احتجاج کا باعث بھی بنتی رہتی ہیں۔ کہیں کہیں سپئیر پارٹس کی دکانیں بھی کھل گئی ہیں ورنہ پان سگریٹ اور ٹھنڈی بوتلوں کے کھوکھے تو جا بجا موجود ہی ہیں۔ اکثر محلے داروں نے اپنے گلی کے رخ کھلنے والے کمروں کو کسی نہ کسی طرح کی دکان میں تبدیل کر رکھا ہے۔ ایک صاحب سے کچھ اور نہ بن پڑا تو انہوں نے اپنے مکان کی بالائی منزل کو جاتی بیرونی سیڑھیوں کے نیچے کی تھوڑی سی جگہ میں بیت الخلاء بنوالیا ہے اور یوں نہ صرف مارکیٹ کے دکانداروں اور مستریوں کے لیے مثانے خالی کرنے کا انتظام ہو گیا ہے بلکہ ظاہر ہے کہ مالکِ مکان کے لیے بھی کچھ اضافی آمدنی کا بندوبست ہو گیا ہے۔

ان محلوں کے کچھ مکان تو ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی ایسی یادگاریں ہیں جو شاید اب اپنی زندگی کے آخری مرحلوں سے گزر رہی ہیں۔ یہ مکان یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہیں ورنہ انکا اپنا دم خم اب باقی نہیں رہا ہے۔ دیواروں کا پلستر صاف ہو

چکا ہے۔اینٹیں اپنی دھار کھو چکی ہیں، انکے بیچ کا مسالہ غائب ہے۔کھڑکیوں کے پٹ کہیں ہیں تو کہیں نہیں ہیں۔بادی النظر میں تو ان مکانوں میں بھوتوں کا رہنا بھی مشکل ہے لیکن ان میں بھی خاندان کے خاندان آباد ہیں۔اور اپنے پورے شور شرابے اور زندگی کی بھرپور رونق کے ساتھ۔

ان محلوں کے مکینوں میں سے زیادہ تر اپنی گلیوں میں بازار کی اس ملاوٹ سے کچھ خوش نہیں ہیں۔کچھ تو آتے جاتے ان گاڑیوں کو جو وہاں مرمت یا صفائی کی غرض سے کھڑی رہتی ہیں، اور ان لوگوں کو جو یہ غرض پوری کر رہے ہوتے ہیں، دیکھ کر ماتھے کے بل اور چہرے کے کھچاؤ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔موقع ملے تو کچھ نہ کچھ کہہ بھی دیتے ہیں۔لیکن زیادہ تر لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے انہیں رہائشی علاقے میں ہونے والی اس ہڑبونگ کی خبر ہی نہیں ہے۔ایک صاحب اپنا سارا فارغ وقت اپنے مکان کے تھڑے، دیواروں اور دیواروں کے سایے کی نگرانی میں گزارتے ہیں۔وہ اپنے گھر کے قریب کھڑی گاڑیوں اور ان سے متعلق افراد پہ کڑی نظر رکھتے ہیں۔انکے دروازوں کی پوڑھیوں پہ بیٹھنا یا دیوار سے ٹیک لگانا تو درکنار، اگر انکے گھر کے سایے میں بھی کوئی زیادہ دیر تک کھڑا رہے تو وہ پہلے تو گھور گھور کے ہی اسکو وہاں سے ہٹا دیں گے اور اگر وہ اس پر نہ مانے تو صاف کہہ دیں گے۔۔۔

''بھائی صاحب، گھر میں زنانے ہیں، بے پردگی ہوتی ہے، آپ ذرا یہاں سے ہٹ جائیں۔'' ایسے موقعے پر کسی کو یہ پوچھنے کا خیال کبھی نہیں آتا کہ کسی کے سایے میں کھڑے ہو جانے سے ایک گھر کے اندر موجود خواتین کی بے پردگی کس طرح ہو جاتی ہے۔

اسی طرح کی ایک گلی میں ایک گھر کی بالکنی کے ساتھ ایک پرانی مزدا بھی کھڑی ہے۔گاڑی اتنی پرانی نہیں ہے جتنی کہ اسکے مالک کی بے توجہی نے اسے بنا دیا ہے۔اسکے رنگ کے بارے میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اصل میں کیا تھا، لیکن ایک بات بہرحال صاف ہے کہ گاڑی کبھی دوبارہ پینٹ نہیں ہوئی ہے۔ونڈ سکرین پہ گرد و غبار کی ایسی دبیز تہہ ہے کہ اسکے آر پار دیکھنا تو کجا، روشنی کا گزر بھی مشکل ہے۔گاڑی کے پہیئے، لگتا ہے کہ جیسے زمین سے نکلے ہیں اور ابھی پوری طرح نکل نہیں پائے ہیں۔

نبیل کو اس گاڑی میں سب سے زیادہ ٹائر ہی شوق دلاتے تھے۔وہ اکثر یہ تصور کرتا تھا کہ اگر کسی طرح یہ گاڑی سٹارٹ ہو جائے تو اسکے پہیے کس طرح زمین چھوڑیں گے۔اس تصور کے ساتھ ہی اس کے دل میں اس گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی ایک بڑی شدید خواہش جاگتی تھی۔وہ کئی بار چپکے چپکے اسکے دروازے سے زور آزمائی بھی کر چکا تھا لیکن یہ برسوں کا زنگ تھا یا قفل، وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ویسے وہ اس گاڑی کے میک، ماڈل، اور اسکی سب خصوصیات کے بارے میں تفصیلی علم رکھتا تھا۔اسقدر تو شاید خود گاڑی کا مالک بھی نہیں جانتا ہو گا۔اگر یہ کہا جائے کہ یہی مزدا نبیل کی گاڑیوں میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کی تحریک بنی تو کچھ غلط نہ ہو گا۔

نبیل کی عمر بارا سال تھی لیکن وہ چہرے سے زیادہ عمر کا نظر آتا تھا۔وہ اسی محلے میں رہتا تھا۔باپ کئی سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ماں اور ایک بڑی بہن تھیں جو دونوں سارا دن لفافے بناتی تھیں اور شام کو نبیل انہیں پاس پڑوس کی دکانوں پر بیچ آتا تھا۔انکی خواہش تھی کہ

نبیل جیسے کیسے پڑھ جائے تا کہ کچھ اچھے دنوں کی نوید بن سکے لیکن نبیل کے کچھ اور ہی خواب تھے۔ اسے پڑھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ پڑھائی کے کچھ ایسا خلاف تھا۔ اسے گاڑیوں سے عشق تھا۔ جہاں اسکی عمر اور طبقے کے بچے دو پہیوں کی سائیکل چلانا سیکھنے کے مختلف مرحلوں سے گزرنا ہی اپنی معراج سمجھتے ہیں، وہ گاڑیوں کے شوق میں مبتلا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جتنا بھی پڑھ لکھ لے، کبھی ایسی نوکری حاصل نہیں کر سکے گا کہ اپنی پسند کی گاڑی میں بیٹھ سکے۔ اسکا باپ کتنا عرصہ ایک پریس میں کام کرتا رہا اور ڈھنگ کا موٹر سائیکل تک نہ خرید سکا۔ خیر اسکی تو خواہش بھی گاڑی کی نہ تھی۔ وہ تو اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے ایک ٹھکانا فراہم کرنا چاہتا تھا تا کہ کرائے کے مکان سے نجات ملے۔ یہ بھی نہ ہوسکا اور وہ ٹی بی میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ لیکن پاس پڑوس میں کتنے ہی ایسے تھے جو بی اے، ایم اے کر کے بھی جوتیاں چٹخاتے پھر رہے تھے یا پھر کوئی چھوٹی موٹی نوکری لے کر گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔

اپنے زاویہء نظر سے نبیل خاصا حقیقت پسند تھا۔ ایک شاندار گاڑی خریدنا اس نے اپنی زندگی کا مقصد قرار نہیں دیا تھا۔ اسے تو صرف ایسی کسی گاڑی میں بیٹھنے کی خواہش تھی۔ اور اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اس نے راستہ بھی ایسا منتخب کیا تھا جو کچھ ایسا ناممکن العمل نہیں تھا۔ کوئی بہت دولتمند، بااثر یا نمایاں شخصیت بننا اسکی خواہش نہیں تھی۔ اسکا خواب تو ایک موٹر مکینک بننا تھا۔ اور اسکے پاس اپنی اس خواہش کے لئے وجوہات تھیں۔ موٹر مکینک اسکا آئیڈیل تھا۔ ایک موٹر مکینک کے علاوہ کون تھا جو روز ایک نئی گاڑی میں بیٹھ سکے۔ ایسا تو شاید اچھے خاصے امیر کبیر لوگوں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن مرمت اور صفائی کرنے والے لڑکے کبھی پولش کی غرض سے، کبھی صفائی کے لیے، کبھی فرش بچھاتے ہوئے، کبھی نشستوں کے غلاف بدلنے کی خاطر روز نئی سے نئی گاڑی میں گھسے رہتے تھے۔ پھر کبھی کبھار تو ڈرائیو کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اکثر صاحب لوگ اس سڑک پر اپنی آسانی کی خاطر گاڑی وہاں کھڑی کر دیتے تھے جہاں انہیں جگہ ملتی تھی، پھر اسکے بعد وہ چابی مکینک کے حوالے کر دیتے تھے تا کہ گاڑی کو کام کے لیے مناسب جگہ پر لایا جا سکے اور ضرورت کے مطابق آگے پیچھے کیا جا سکے۔ زیادہ تر لوگ تو موسم کی سختی، شور اور ماحول کی پروا کیے بغیر وہیں کھڑے رہ کر کام کی نگرانی کرنا پسند کرتے تھے۔ لیکن کچھ نازک مزاج ایسے بھی ہوتے تھے جو گاڑیاں چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور شام کو آ کر لے جاتے تھے۔ اس دوران گاڑی کا ڈیک اکثر مسلسل چلتا رہتا تھا اور مکینک صاحب کام کے دوران اپنی پسند کی موسیقی سنتے رہتے تھے۔ کچھ مکینکوں کے تو صاحب لوگوں کے ساتھ اتنے مراسم تھے کہ کام مکمل ہونے کے بعد وہ خود ہی گاڑی صاحب کے گھر بھی چھوڑ آتے تھے۔ یہ تو خیر نبیل کے خواب کی معراج تھی۔ فی الحال تو وہ کسی اچھے مکینک کا چھوٹا بن کر کام سیکھنے کی تگ و دو میں تھا۔ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ موٹر مرمت کی اس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اور کسی میرٹ کی ضرورت تھی یا نہیں لیکن ہر استاد کم از کم بھروسے اور اعتماد کا ایک سفارشی ضرور مانگتا تھا۔ نبیل کو ایسا سفارشی کہاں سے میسر آتا۔ اسکی ماں تو یوں بھی اس بات کی سخت مخالف تھی کہ وہ اس کام میں پڑے۔ اسکی سمجھ میں نبیل کی پڑھائی سے کم کوئی بات اترتی ہی نہیں تھی۔ مگر وہ بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ اس نے اس انڈسٹری میں راہ بنانے کے لیے نکتہء آغاز کا انتخاب کر ہی لیا تھا۔ اس نے اپنی مہینوں کی جمع کی ہوئی رقم

سے بڑی بڑی دکانوں سے کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں سستے داموں خریدی تھیں جیسے وائپرز کے ربر، والوکورز اور سٹکرز وغیرہ۔ اپنی یہ مختصر سی دکان اپنے ہاتھوں میں سجائے، وہ سارا سارا دن اپنے ہی جیسے بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ گاہک کی تلاش میں پھرتا رہتا تھا۔ اسی تلاش کے دوران ایک مرحلہ اور طے ہوا۔ یہ مال صرف بیچنا ہی نہیں تھا۔ اسے گاڑی میں فکس کرنا بھی آنا چاہیئے تھا۔ سادہ سا سٹکر یا والوکورز لگانا تو مسئلہ نہیں تھا گو اس کام میں بھی بہت صفائی کی ضرورت تھی، لیکن دوسری بہت سی چیزیں تو بڑی مہارت کا تقاضا کرتی تھیں۔ پھر اس سے زیادہ مہارت گاہک کو قائل کرنے کے لیے درکار ہوتی تھی۔ نوعمر نبیل نے یہ ساری مہارتیں اپنے انہی ساتھیوں سے سیکھی تھیں۔ ونڈ سکرین پر پانی کے داغ دکھا کر موجودہ وائپرز کی خامی کی طرف توجہ دلانا، مڈگارڈز کی میچنگ اور ان سے گاڑی کی خوبصورتی میں ہوتا ہوا اضافہ واضح کرنا، سن شیڈز کی افادیت سمجھانا، کچھ ہی دنوں میں یہ سب اسکا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔

گاڑیوں کے مالکان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ کچھ تو سنتے ہی بھاؤ تاؤ شروع کر دیتے تھے۔ کچھ صاف منع کر دیتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ایک آئیٹم کو بدل بدل کر جانچتے پرکھتے تھے، کئی بار فکس بھی کروا لیتے تھے، اپنی مرضی کی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں کروا کر بار بار ہر زاویے سے دیکھتے اور مول تول کا معاملہ آخر کے لیے چھوڑ دیتے۔ پھر اگر بھاؤ نہ بنتا تو بڑی آسانی سے کہہ دیتے: ''اتارلو''۔ لیکن اسے سب سے برے گاہک وہ لگتے تھے جو اسکی ساری تقریر ایسے سنتے تھے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ انکے نزدیک وہ جیسے وہاں موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ گو یہ لوگ اس لحاظ سے اچھے تھے کہ وہ اسے کوئی جھوٹی آس نہیں دلاتے تھے اور فضول میں اسکا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے تھے جو اس صورت میں اسے اپنی آئیٹمز کی مارکیٹنگ کی عملی کوششوں میں لامحالہ لگانا پڑتی تھی جب گاہک اسکی زبانی کوششوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار، چاہے فقط ہوں ہاں سے ہی، کر رہا ہو۔ لیکن وہ اس میں خوش رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو سارا مال بکنے پہ اسکا منافع صرف ریٹیل اور ٹریڈ قیمتوں کا فرق ہی ہوتا تھا اور وہ ساری محنت اور وقت جو اس نے صرف کیا ہوتا تھا مفت میں جاتا۔ اکثر سارا دن کی محنت کا معاوضہ صرف سو پچاس روپے کی صورت میں حاصل ہوتا۔ لیکن وہ ان باتوں سے کبھی دل شکستہ نہیں ہوا۔ اسے کام میں مزہ آتا تھا۔ جب وہ گاڑی کو چھوتا تھا، اسکے نیچے لیٹتا تھا، اسکے پیچ کھولتا یا کستا تھا، اسکے ساتھ ایک تھوڑی سی دیر کا رشتہ قائم کرتا تھا، تو اس وقت کی، اس تعلق کی سرخوشی اسے موسم کی کسی سختی یا بھوک پیاس کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔

آہستہ آہستہ اسکے اوپر دکانداروں کا اعتبار بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو وہ ادھار پر مال اٹھا لیتا تھا اور دن ڈھلے بکی ہوئی چیزوں کے پیسے اور باقی بچا ہوا مال واپس کر جاتا۔ بڑا سامان جیسے وہیل کیپس، جالیاں اور مڈفلیپس بھی اب اسکی دسترس میں تھے۔ اسے یہ سب اٹھائے اٹھائے پھرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو چیز چاہیئے ہوتی، دکان سے لیجا کر گاہک کو دکھا دیتا اور نہ بکنے پر واپس بھی کر دیتا۔

اسکی ماں اسکی ان حرکتوں سے ناواقف نہیں تھی۔ پہلے پہل تو اس نے نبیل کو بہت سمجھایا۔ بڑے واسطے دیے، ناراض بھی ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ نبیل کا پڑھ لکھ جانا ہی اس گھر کے سارے مسائل کا حل ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ پڑھائی جو ایسے مسائل کا حل

ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ نبیل کے خوابوں کو تعبیر بھی دے سکے کہاں تک کرنی پڑتی ہے اور لفافوں کی آمدنی کے بس میں ہے بھی یا نہیں۔ اسے تعلیم سے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے نوکری تک کے مراحل کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس بارے میں کچھ ایسا خاص علم نبیل کو بھی نہیں تھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اپنے وسائل کے مقدور بھر وہ کبھی اپنا شوق پورا نہیں کر سکتا۔ یہ اسکی خود غرضی ہی سہی، لیکن عمر کی اس منزل میں اسے اس سے زیادہ کا کچھ اندازہ بھی نہیں تھا۔ بہن کی شادی کی فکر یا ماں کی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس ابھی اسکے شعور کے دروازے پہ دستک نہیں دیتا تھا۔ پھر جب اسکی کبھی کبھار کی سو پچاس کی آمدنی نے گھر کے خرچے میں کہیں کہیں تھوڑا تھوڑا حصہ بٹانا شروع کیا تو رفتہ رفتہ اسکی ماں بھی اسکی پڑھائی کے نقصان پہ سمجھوتہ کرتی چلی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ ماں اور بہن کے لیے کوئی تحفہ بھی خرید لاتا۔ ورنہ سینما چوک سے شاہی نان چنوں کا کھانا تو اکثر ہی گھر لیجاتا۔

گھر میں اس قبولیت کی شکر گزاری کے طور پر وہ حتی الامکان کوشش کرتا تھا کہ ماں کو اس سے کوئی اور شکایت نہ ہو۔ سیپارے کا سبق بھی باقاعدگی سے لیتا چاہے کتنا ہی تھکا ہوا کیوں نہ ہو۔ مولوی صاحب تو اسکی دستیابی کے وقت میسر نہیں آسکتے تھے، بہن یا ماں ہی پڑھاتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ اعراب لگے عربی کے حروف ہجے کر کے بھی نہ پڑھ سکنے والے اس بارا تیرہ سال کے لڑکے کو گاڑیوں کے کتنے نام یاد تھے۔ صرف نام ہی نہیں، اس نے تو لگتا تھا کہ گاڑیوں کے بارے میں ساری معلومات گھول کے پی لی تھیں۔ نئی سے نئی گاڑیوں کے نام، میک، ماڈل، اور سی سی میں انکی طاقت تو ایک طرف، اسے تو گاڑیاں بنانے والی کمپنیوں کی تازہ ترین درجہ بندی تک معلوم تھی۔ پھر کون سی کمپنی کیسی گاڑی بنا رہی ہے، کس ماڈل میں کیا خوبیاں ہیں، کس برانڈ کی بریک عمدہ نہیں ہے اور کونسی کار بجٹ کے اعتبار سے ٹھیک نہیں ہے، کونسے ٹائر رفتار کے لحاظ سے اچھے ہیں اور کن ٹائروں کی سڑک پہ گرفت زیادہ بہتر ہے۔ یہ ساری معلومات اسے ازبر تھیں۔ وہ کبھی کسی کار کے اندر نہیں گھسا تھا، گو اسکی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی، لیکن وہ بتا سکتا تھا کہ ٹیوٹا کی نشستیں زیادہ آرام دہ ہیں یا ہنڈا کی۔ وہ مختلف گاڑیوں کے اے سی اور ہیٹر کی کارکردگی، انکے پاؤں کے نیچے بچھنے والے میٹس کی نرمی، سیٹوں کے کشن کے گداز، اور سواریوں کی گنجائش کے بارے میں حق الیقین کا سا علم رکھتا تھا۔ نئی آٹو میٹک گاڑیوں کی کیا خوبیاں ہیں اور کون سی خامیوں کے باعث گنجان سڑکوں پہ انکا چلانا مناسب نہیں ہے۔ پاورڈ ونڈو (powered window) میں اکثر کیا خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے بچنے کے لیے کیا احتیاط ضروری ہے؟ کون سے نئے ماڈل پٹرول کم خرچ کرتے ہیں اور گیس پر تبدیل کروانے سے کیا نقصانات ہوتے ہیں؟ اسے سب پتہ تھا۔ کس سن میں کس کمپنی نے گاڑی کے ڈیزائین میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے؟ رفتار پہلے سوئیوں کے ذریعے بتائی جاتی تھی تو اب نمبروں سے دکھائی جاتی ہے۔ کس ماڈل میں اشارے اطراف کے شیشوں پہ بھی لگ گئے ہیں، اور کون سے ماڈل میں رفتار کی حد کتنی بڑھا دی گئی ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب نبیل کو معلوم تھے۔

یہ ساری معلومات اسنے اسی منٹگمری روڈ پہ گھومتے پھرتے، سپئیر پارٹس کی دکانوں، ورکشاپ کے طور پر استعمال ہوتے فٹ

پاتھوں، سڑک کی ذیلی گلیوں میں کھڑی گاڑیوں کے نیچے لیٹے مستریوں اور اپنے دکان بدوش ساتھیوں سے چنی تھیں۔ ہاں اسکے پاس مجموعی ذخیرہ شاید اپنے تمام ذرائع کی انفرادی معلومات سے زیادہ تھا۔ لیکن کس کام کا یہ علم جسکے باوجود کوئی مستری یا کاریگر اسے کام سکھانے پہ ابھی تک راضی نہیں تھا۔ خیر اب وہ پہلا سا اجتناب بھی نہیں رہا تھا۔ کسی استاد کا اپنا کوئی چھوٹا آس پاس نہ ہوتو اسے کبھی کبھار کسی گاڑی کے نیچے لیٹے یا انجن میں سر دیے ہوئے کاریگر کو کوئی ہتھیار پکڑانے کا موقع بھی مل ہی جاتا تھا۔ کسی گاڑی میں گھسنا، سکرین کے اس پار سے دیکھنا، سیٹ کے گداز کا لمس لینا، گاڑی کی ائرفریشنر سے معطر فضاء میں سانس لینا، بہرحال ابھی ایک خواب تھا۔

نبیل مایوس نہیں تھا۔ اسکے خواب کی تعبیر کا سفر جاری تھا۔ اصل میں اس نے خواب بھی کچھ اپنی اوقات سے باہر کا نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنی گاڑی کی تمنا نہیں کی تھی۔ جیسی گاڑی میں وہ بیٹھنا چاہتا تھا، ویسی گاڑی کے تو ساری زندگی میں وہ ٹائر تک نہیں خرید سکتا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر وہ گاڑیوں کا مکینک بن جاتا تو ہاں، وہ اچھی سے اچھی گاڑیوں میں، جو بہت چھوٹے چھوٹے سے معمولی کاموں کے لیے یا اضافی آرائش کی خاطر منٹگمری روڈ پہ آتی تھیں، بیٹھ سکتا تھا، اور کبھی کبھی موقع ملنے پر ڈرائیو بھی کر سکتا تھا۔ یہ خواہش کچھ ایسی لاحاصل نہیں تھی۔ منٹگمری روڈ اس جیسے، اس جیسی طبقاتی نسل سے تعلق رکھنے والے لڑکوں سے، لوگوں سے بھری پڑی تھی جو سارا دن یہی کام کرتے رہتے تھے۔ گاڑیوں کے کام کرنے کے علاوہ وہاں اور بہت سے لوگ بھی تھے۔ اخبار فروش، پانی بیچنے والے جو کولر اور گلاس اٹھائے پھرتے تھے، عینکوں کے تختے لیے گھومنے والے لڑکے جو دھوپ کے چشمے بیچتے تھے۔ پھر وہاں ڈھنگ ڈھنگ کے مانگنے والے بھی تھے۔ کچھ تو ٹوپیاں اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بیچنے کے بہانے مانگتے تھے اور کچھ براہِ راست۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ضعیف عورتیں، بظاہر معزز نظر آنے والے سفید پوش مرد، نوعمر لڑکے اور بچے۔ یہ منٹگمری روڈ کی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا کی گوناگوں جہتیں تھیں۔ اسی دنیا کا ایک کردار ہمارا نبیل بھی تھا۔ جو اپنے آس پاس کی ہر شے سے بے نیاز ایک چھوٹی سی خواہش کو نصب العین بنائے اپنی زندگی کے راستے پہ گامزن تھا۔

نئی نکور، چمکتی دمکتی، بیش قیمت گاڑیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے انکی مقناطیسی کشش صاف محسوس ہوتی تھی۔ وہ روز جدید ترین ٹیکنالوجی کی شہکار ہائیبرڈ، ری بورن، آٹومیٹک گیئر والی کاریں دیکھتا تھا، انکے آس پاس گھومتا رہتا تھا، گاہے انہیں چھو بھی لیتا تھا۔ انکا لمس اسکے لیے جیسے حیات آفریں تھا۔ اسکے دبلے پتلے کمزور سے جسم کو توانائی بخش دیتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو کسی چھوٹے موٹے آرائشی یا مرمت کے کام کے سلسلے میں وہ کئی گھنٹے اپنی کسی پسندیدہ گاڑی کی صحبت میں گزار دیتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ٹویوٹا کی ۱۳۰۰ سی سی بیلٹا گاڑی کا فرش بچھ رہا تھا۔ فرش تو خیر اسکا اپنا فسٹ کلاس تھا، بس کچھ محتاط لوگ اس فرش کے اوپر، فٹ میٹس کے نیچے پلاسٹک کی ایک چادر ڈلوانا پسند کرتے ہیں تاکہ صفائی آسان ہو۔ اس مقصد کے لیے سیٹیں بھی کھولنا پڑتی ہیں۔ بیلٹا کی ڈرائیور سیٹ کا ایک سکریو نہیں کھل رہا تھا جب مستری کی نظر قریب کھڑے نبیل پہ پڑی۔ ایک ہاتھ سے سکریو ڈھیلا کرنیکی کوشش کرتے ہوئے اسنے سر اٹھا کے نبیل کو دیکھا اور

کہا: ''اسکے بازو پتلے ہیں، سیٹ کے نیچے بچھا لے گا، اوئے بلو، ذرا ادھر تو آ۔'' لیکن اسی وقت پیچ کھل گیا۔ اور نبیل کو اپنی خواہش کے سفر کے پہلے قدم سے ہی لوٹنا پڑا۔ ایک دوسرا موقع زیادہ خوبصورت اور نسبتاً مہذب تھا۔ اس دن کالی سیاہ چمکتی ہوئی ہنڈا اسوک ری بورن بھیڑ میں سے راستہ بناتی جیسے تیرتی ہوئی عالم آٹو سٹور کے آگے آ کر رکی۔ اس سبک خرامی میں گاڑی کی خوبی کے علاوہ ڈرائیور کی مہارت کا بھی کچھ حصہ تھا۔ گاڑی کے سارے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور سیاہ تھے۔ اسے اپنا راستہ بنانے کے لیے، لگتا تھا کہ جیسے باہر موجود اشاروں سے مدد کرتے اور چیختے چلاتے لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔ گاڑی بالکل نئی اور مکمل تھی لیکن اسکا ڈرائیور کی طرف والا سائیڈ ویو مرر خراب تھا۔ پاورڈ مرر تھا جو کسی لاپرواموٹر سائیکل سوار کی تیزی اور غفلت کا شکار ہوا تھا اور اب اندر سے کنٹرول نہیں ہوتا تھا، بٹن دبانے پہ پورا کھل جاتا تھا، رکتا نہیں تھا۔ ڈرائیور نے جب عالم آٹو سٹور سے کسی ایسے مستری کے بارے میں پوچھا جو اس شیشے کو ٹھیک کر سکتا ہو تو نبیل وہیں کھڑا تھا۔ وہ اکثر اسی دکان سے سامان لیتا تھا۔

چھوٹے عالم صاحب نے نبیل کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''بلو، ایسا کر، تو بھائی کو ارشاد مستری کے پاس لے جا۔ بشیر سیٹ کورز کی دکان کے سامنے گاڑی رکوا لینا، گلی میں سامنے ہی بیٹھا ہوگا۔'' پھر ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا: ''بچے کو بٹھا لیں ساتھ، یہ آپ کو لے جائے گا۔'' نبیل کے دل نے جیسے اچھلنا شروع کر دیا تھا۔ پہلا موقع ہی ایسا شاندار۔ ایسی گاڑی! اسکے کندھے پہ رکھا ہوا چھوٹے عالم کا ہاتھ وزنی ہوتا جا رہا تھا۔ آس پاس کی سب آوازیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی اور دنیا میں تھا۔ لیکن ڈرائیور کی آواز، اسکے الفاظ کے ساتھ ساتھ حقیقی ہوتی چلی گئی اور نبیل کو اپنی دنیا میں واپس لے آئی۔

''بشیر سیٹ کورز دیکھی ہے میں نے، میں چلا جاؤنگا۔ گلی میں ارشاد کی دکان کونسی ہے؟''

''دائیں ہاتھ پہ تیسری دکان ہے۔ کسی سے بھی پوچھ لینا۔'' چھوٹے عالم نے کہا۔ چنانچہ ہمارا نبیل وہیں کھڑا رہ گیا اور ری بورن جیسے تیرتی ہوئی سی آئی تھی ویسے ہی عمدگی اور سکون سے واپس ہوئی اور منٹگمری روڈ کی لامتناہی بھیڑ کو کائی کی طرح چیرتی ہوئی چلی گئی۔ نبیل نے اپنی گردن سے لپٹا ہوا رومال اتارا، اس سے منہ صاف کیا اور سٹور میں سامان کی طرف بڑھ گیا۔ گمان غالب ہے کہ اس نے اپنے آنسو پونچھے ہونگے کیونکہ وہ اس رومال سے کبھی چہرے کا پسینہ، گرد و غبار یا ہاتھوں پر لگی ہوئی چکنائی اور میل کچیل صاف نہیں کرتا تھا۔ نبیل کا یہ رومال ہمیشہ بہت اجلا اور بے داغ رہتا تھا۔ یوں تو نبیل سب کا سب ہی اپنے باقی تمام ہم منصبوں کی نسبت بہت صاف ستھرا لڑکا تھا۔ کپڑے میلے ضرور ہوتے تھے لیکن ان پہ تیل اور گریس کے دھبے نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن رومال کے سلسلے میں وہ خاص اہتمام کرتا تھا۔ اس نے اس رومال کا استعمال شاید محض ایک علامت کے طور پر کیا تھا۔ اسکے قبیل کے زیادہ تر لڑکے اپنے کام کے اوقات میں اسطرح کا ایک رومال ضرور اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر یا کندھے پر ڈالے رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں وہ اس رومال کو گندے کپڑے کی ایک دھجی سی بنا دیتے ہیں وہاں نبیل نے ہمیشہ اس رومال کو بہت حفاظت اور سلیقے سے برتا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اسکی صفائی کا اتنا خیال کیوں رکھتا تھا۔

اس دن ایک چار دائروں والی آڈی (AUDI) دکان پر آ کر رکی۔ اسکی پالش کی ہوئی چمکدار سطح پہ نظر پھسلتی تھی۔ بے داغ، بے نقص! جانے اس گاڑی کو کس کام کی ضرورت ہوتی، اس میں کیا کمی تھی۔ اس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ گاڑی کا مالک اصل میں کسی سلسلے میں عالم سیٹھ سے ملنے آیا تھا۔ سیٹھ عالم نے نبیل سے ہی اپنے مہمان کے لیے ملک شیک منگوایا اور جب وہ مشروب لے کر آیا تو اس سے کہا: ''بلو بیٹا، ذرا صاحب کی پچھلی نمبر پلیٹ تو دیکھ لے، کوئی پیچ ویچ ڈھیلا ہے اسکا، ذرا دھیان سے کس دے!''

نبیل نے سرشاری سے یہ حکم سنا اور اپنی زندگی میں دیکھی ہوئی سب سے قیمتی گاڑی کے قرب کے نشے میں مخمور اپنا اوزار کا چھوٹا سا تھیلا اٹھا کر گاڑی کے پیچھے جا بیٹھا۔ وہ اتنا کمزور اور چھوٹا سا تھا کہ جب وہ نمبر پلیٹ کھول کر دوبارہ سے سارے سکریو کس رہا تھا تو گاڑی کے سامنے یا ایک طرف سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آڈی کا مالک آکر دوبارہ گاڑی میں بیٹھا تو اسے نبیل بالکل نظر نہیں آیا، بلکہ گاڑی سٹارٹ کر کے ریورس گیئر میں ڈالنے پہ بھی اسے پچھلے کیمرے میں نبیل کی موجودگی کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ ادھر نبیل کو گاڑی کے نفیس دروازے کے بند ہونے کی ہلکی سی آواز تو آئی اور انجن کے سٹارٹ ہونے کا ارتعاش بھی محسوس ہوا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ سیٹھ اور اسکا دوست یہ بات بھول چکے ہیں کہ نبیل گاڑی کی نمبر پلیٹ پہ کام کر رہا ہے۔ اس نے یہی سوچا کہ گاڑی سٹارٹ کر کے شاید وہ گاڑی والا سیٹھ، سیٹھ عالم کو انجن کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب گاڑی پیچھے کی طرف چلی تو گو اسکی رفتار بہت کم تھی لیکن ۱۴ سلنڈر کے انجن کا ہلکا سا جھٹکا نبیل کے لیے بہت زیادہ ثابت ہوا۔ اسکا سر سڑک سے ٹکرایا اور نچلا دھڑ گاڑی کے نیچے آ گیا۔ سیٹھ نے گاڑی فوراً روک دی۔ نبیل نے دیکھا کہ اسکے گرد بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ وہ زور زور سے بول رہے تھے لیکن اسے انکی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ اسکے سر میں تکلیف کی جو ایک چمک اٹھی تھی وہ ریڑھ کی ہڈی میں جا کر ٹھہر گئی تھی۔ پھر کچھ لوگوں نے مل کر اسے گاڑی کے نیچے سے نکالا۔ کسی نے پانی بھی پلانے کی کوشش کی۔ پھر اسے سیٹھ کی آواز سنائی دی، جیسے کسی کنوئیں سے آ رہی ہو۔

''اسے گاڑی میں ڈالو فوراً۔ میں اسے ہسپتال لے کر جاتا ہوں۔''

آڈی کا پچھلا دروازہ کھلا اور نبیل کو پچھلی سیٹ پہ ڈال دیا گیا۔ ایک دولڑکے اسکے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ سیٹھ عالم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پہ بیٹھے تھے۔ دنیا کے بہترین شاک ابزاربرز (Shock Absorbers) کے باوصف ایک انتہائی ہموار اور غیر تکلیف دہ سفر شروع ہوا۔ نبیل پچھلی سیٹ پہ پڑا ہوا اپنی ہر لحظہ کم ہوتی ہوئی حسیات کے ساتھ گاڑی کے شاندار اندرون کا جائزہ لیتے ہوئے شاید سوچ رہا تھا کہ آڈی میں سفر کرنے کی یہ قیمت کچھ ایسی زیادہ تو نہیں ہے۔ اسنے دیکھا کہ فرش کا رگ عین اس جگہ سے بھیگ رہا ہے جہاں سیٹ پہ اسکا چہرہ رکھا ہوا تھا۔ اسکی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے اپنی گردن سے لپٹا ہوا رومال کھولا اور فرش پہ وہاں رکھ دیا جہاں خون گر رہا تھا۔

 

خاک شدہ ای

جمیلہ اتنی خوبصورت تھی کہ اگر ہمیں گھریلو ملازمہ کی اشد ضرورت نہ ہوتی تو افشاں بیگم اسے کبھی کام پر نہ رکھتیں۔ گو حالات نے کم عمری ہی میں اسکے حسن کو گہنا دیا تھا لیکن پھر بھی جمیلہ کے پاس بیویوں کو خوفزدہ کر دینے والی سبھی خوبیاں موجود تھیں۔ قد اگر ذرا سا بھی اور زیادہ ہوتا تو دراز کہلاتا، بدن ایسا متناسب کے مرد کی بری نگاہ سے سات پردوں میں بھی نہ بچ سکے، چال میں وہ انداز کہ جو بدن کے اس تناسب کے ساتھ قدرت بونس میں عطا کرتی ہے اور جسکے حصول کے لیے ماڈل خواتین گھنٹوں مشق کرتی ہیں، جلد نے غذائی کمی اور دھوپ کی زیادتی کے باوجود اپنی ملائمت اور سرخ وسفید رنگت پوری طرح نہیں کھوئی تھی۔ بال، اگر وہ کس کر چوٹی میں نہ باندھے رکھتی تو ضرور اسے اور دیکھنے والوں کو ہروقت الجھائے رکھتے۔ ہاتھ پاؤں گواہی دیتے تھے کہ اسے آسائش کی زندگی ترک کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ ناک اتنی ستواں اور باریک تو خیر نہیں تھی کہ اس سے چیر پھاڑ کے کسی آلے کا کام لیا جاسکتا لیکن اسے دیکھ کر اندر ہی اندر کوئی چیز کٹتی ضرور تھی۔ ہونٹ جمیلہ کے چہرے کا سب سے جاندار حصہ تھے۔ لگتا ہے میر صاحب کی ملاقات ضرور ایسے ہی ہونٹوں والی کسی خاتون سے ہوئی ہوگی جو انہوں نے ''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے'' والا شہرہء آفاق شعر کہا تھا۔ جمیلہ کی آنکھیں ہم کبھی نہ دیکھ سکے۔ گمان غالب ہے کہ باقی چہرے کی طرح وہ بھی انتہائی خوبصورت ہونگی۔ اصل میں اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں، چنانچہ اس مد میں ہمارا مشاہدہ بھنوؤں کی کمانوں اور انکے نیچے پلکوں کی جھالروں تک ہی محدود تھا۔

جمیلہ کے بارے میں ہمارا بیان نامکمل رہے گا اگر غم ویاس کے اس تاثر کا ذکر نہ کیا جائے جس نے اسکی شخصیت پر ایک سایہ تان رکھا تھا۔ وہ بولتی بہت کم تھی اور شاید ہنستی بالکل نہیں تھی۔ گاؤں کی ایک الھڑ مٹیار نے جیسے اپنے ہنسی کھیل کے دنوں میں اچانک افسردگی کی کالی چادر اوڑھ لی تھی۔ تاج محل پر جیسے شام اترتے اترتے ٹھہر گئی ہو۔ اس تاثر نے اسکے حسین سراپے کو ایک تمکنت بخش دی تھی۔ وہ گھریلو ملازمہ کے لیے ناموزوں ترین امیدوار تھی۔

یہ افسردگی کی چادر بھی خوب ہے۔ ایک دفعہ ٹھیک سے اوڑھ لو اور پھر ڈٹ کر وقت کی راکنگ چیئر پر بیٹھ جاؤ، زندگی نہ صرف ادب سے سر نیہوڑا کے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو جائیگی بلکہ کچھ عجب نہیں اگر پنجوں کے بل چلتی ہوئی الٹے پاؤں کمرے سے باہر ہی نکل جائے۔ یہ خود تو بندے کو رفتہ رفتہ گھن کی طرح کھا جاتی ہے لیکن مجال ہے جو کسی اور دکھ کو قریب پھٹکنے دے۔ پریشانیوں کی کڑی دھوپ ہو، مجبوریوں کے برفانی تھپیڑے، جسمانی مشقت کی کسل ہو کہ ذہنی تناؤ۔ سب کچھ اس چادر کے دامن سے دھول بن کے چمٹا رہتا ہے،

اوڑھنے والے تک نہیں پہنچ پاتا۔

اس سے پہلے جو خاتون ہمارے ہاں کام کرتی تھیں وہ شہر کے کسی سرکاری سکول میں بھی خادمہ کے طور پر ملازم تھیں۔ انکا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہوگیا۔ جاتے ہوئے وہ اپنا کوئی متبادل بھی فراہم نہ کرسکیں۔ افشاں بیگم کام کے اچانک بڑھ جانے والے بوجھ سے یونہی بولائی ہوئی تھیں کہ بھائی صاحب خالہ بی کو بھی ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔

خالہ بی ہمارے خاندان کی سب سے بزرگ خاتون تھیں۔ انکی اپنی اولاد نہیں تھی۔ شوہر کے انتقال کو ایک مدت گزر چکی تھی۔ یوں انکی ذمہ داری بھائی صاحب نے ہی سنبھال رکھی تھی لیکن کبھی کبھی ضرورتاً یا تبدیلی کی خاطر وہ انہیں کچھ عرصے کیلئے ہمارے ہاں چھوڑ جاتے تھے۔ وہ عمر اور صحت کے اس مقام پہ تھیں جہاں انہیں ہر وقت ایک خبر گیر کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ جونہی جمیلہ اپنے شوہر کے ساتھ کام کی تلاش میں ہمارے گھر آئی، افشاں نے اسے فوراً ملازم رکھ لیا۔

جمیلہ کے شوہر کو دیکھ کر یقین آسکتا تھا کہ جوڑے آسمانوں پر ہی بنائے جاتے ہیں کیونکہ ایسا جوڑا بنانے کے لیے جو حوصلہ درکار تھا وہ زمین پر شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ جتنی یہ خوبصورت تھی، اتنا ہی وہ کم روتھا۔ پھولی ہوئی ناک کے نیچے مونچھوں کا جھاڑ جھنکار، چہرے کا رنگ تو سیاہ تھا ہی، ہونٹوں کی سیاہی میں کچھ نیلاہٹ بھی شامل ہوگئی تھی۔ آنکھیں میلی اور چوکس۔ جیسے ہر وقت ہر کسی کی نگرانی کر رہی ہوں، خاص طور پر جمیلہ کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی دیو کے قبضے میں کوئی پری ہو۔ وہ روزانہ صبح سویرے اسے ہمارے گھر چھوڑ جاتا اور شام سے پہلے پہلے لینے کے لیے آجاتا۔ اگر کسی وجہ سے جمیلہ کو کام سے فارغ ہونے میں ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو وہ واضح طور پر مضطرب نظر آنے لگتا۔

جمیلہ کی وجہ سے گھر کے کام کاج میں جو آسانی ہوئی سو ہوئی، افشاں بیگم کے اندر وہ شرلاک ہومز بھی جاگ گیا جو قدرت نے ہر عورت کی فطرت میں رکھا ہے۔ خاص طور پر ہمارے ہاں کی عورتوں میں۔ چنانچہ جمیلہ کے بارے میں مختلف اندازے قائم کرنے اور اپنے ہی وضع کردہ کئی طرح کے امتحانوں سے ان اندازوں کی درستگی جانچنے کا کھیل شروع ہوگیا۔ اس کھیل میں خالہ بی بھی جی جان سے شریک تھیں۔ ہماری حیثیت ایک ایسے جج کی سی تھی جس سے اسکا فیصلہ نہ مانگا جائے، صرف اپنے تجزیوں اور ان سے جنم لیتی ہوئی آراء سے آگاہ رکھا جائے تاکہ آئندہ کے لیے سند رہے۔ ہم ایسے موقعوں پہ تھوڑی سی ابتدائی بحث تمحیص کے بعد افشاں بیگم سے متفق ہوجایا کرتے ہیں۔ ہمارے متفق ہوجانے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ افشاں بیگم کی رائے اٹل ہوا کرتی ہے، ہمارے ماننے نہ ماننے سے تبدیل تو ہو نہیں سکتی اور دوسرے یہ کہ اکثر اوقات ان کی رائے درست بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جمیلہ کے لب ولہجے، انداز واطوار، رویے اور حرکات وسکنات کے چند دن کے گہرے مطالعے، کچھ ضروری سوالات اور انکے غیر تسلی بخش جوابات کے بعد ایک دن افشاں نے اپنے اندازے کا اظہار کردیا:

''یہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے اور شاید اب اپنے فیصلے پہ پچھتا رہی ہے۔''

اس بیان کے دوسرے حصے میں 'شاید' کا لفظ افشاں بیگم کی رائے کی قطعیت کے ساتھ میل تو نہیں کھاتا تھا لیکن غیر ضروری اس

لیے نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے جمیلہ کے بارے میں تحقیق و جستجو کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے حسبِ معمول شروع میں اس رائے سے اختلاف کیا جو اگر ہم نہ کرتے تو افشاں بیگم کو مایوسی ہوتی کیونکہ اسی اختلاف کی بناء پر انہیں پوری شدومد سے اپنے دلائل وشواہد بیان کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

''تم تو خواہ مخواہ ہر ایک پہ شک کرتی ہو۔ اچھی خاصی بھلی مانس لڑکی ہے۔''

''خیر میں تو وہی کہتی ہوں جو آنکھوں کو دکھتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے، پہلے اپنے گاؤں کا نام اور بتایا تھا، آج اور بتا دیا۔ میں نے جو ٹوکا تو گھبرا کے کہنے لگی وہ ننھیال کا گاؤں ہے۔''

''تو ہوگا ننھیال کا ہی، اور تفتیشی افسر کے سامنے تو بے گناہ بھی گھبرا جاتا ہے۔''

''آپ مانیں یا نہ مانیں، اسکی چال ڈھال، اسکا ڈرا سہا انداز ہی کہے دیتا ہے۔''

''محترمہ، شاید آپ نہ جانتی ہوں لیکن ہمارے ہاں کی اسی (۸۰) فیصد لڑکیاں یونہی ڈری سہمی رہتی ہیں۔''

''جی ہاں۔۔۔ اور لڑکیوں کے معاملے میں آپکی معلومات کو کون چیلنج کر سکتا ہے۔''

ہم ان دنوں خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے ایک ادارے سے منسلک تھے اور اپنے روزگار کے اس نسوانی وسیلے کے بارے میں اکثر افشاں بیگم کے طنزیہ تبصرے سنتے رہتے تھے۔

ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے سہ پہر کی چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ سارا دن صحن میں پڑے رہنے کے بعد اس وقت دھوپ برآمدے میں سرک آئی تھی۔ جمیلہ چائے کی ٹرالی لے کر آئی تو گفتگو میں وقفہ آ گیا۔ باہر پورچ سوکھے ہوئے پتوں سے ڈھک رہا تھا۔ مغرب میں جھکتے ہوئے سورج کی کرنیں انہیں ایک انوکھا رنگ دے رہی تھیں۔ ہمیں یہ منظر جتنا بھلا لگتا تھا، افشاں کو اسی قدر اس سے وحشت ہوتی تھی۔

''یہ پتے کیاریوں میں سور دو'' انہوں نے جمیلہ سے کہا، ''پھر اگر جانا چاہو تو چلی جانا۔''

جمیلہ جھاڑو سنبھال کے پورچ میں گئی تو خالہ بی نے، جو سلسلہء کلام میں وقفہ آ جانے سے بے مزہ معلوم ہوتی تھی، بات وہیں سے شروع کر دی جہاں وہ رکی تھی۔

''دلہن ٹھیک کہہ رہی ہیں میاں، کل میں نے پوچھا، تیرے اماں باوا نہیں آتے کبھی تیرے پاس، تو لمبی سانس بھر کر بولی، ناراض ہیں۔''

''تو خالہ بی، کیا پتا ناراض ہی ہوں اور وہ اسی وجہ سے ایسی اداس رہتی ہو۔''

''ناراض تو خیر ہیں ہی۔۔۔'' افشاں بیگم نے کہا، ''اور اسی وجہ سے ہیں کہ وہ گھر چھوڑ کے بھاگ آئی ہے۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ الٰہی بخش جیسے شخص کے ساتھ بھاگنے کے لیے اسے کم از کم اندھا ضرور ہونا چاہئے تھا۔''

''اجی یہ عمر اندھی ہی ہوتی ہے۔ سر پہ عشق کا بھوت سوار ہو تو آنکھوں کو کچھ نظر آتا ہے اور نہ ہی دماغ کو کچھ سوجھتا ہے۔''

''سچ کہا آپ نے۔'' ہم نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی آواز کو اس قدر دباتے ہوئے کہ خالہ بی نہ سن سکیں، کہا۔ ''کچھ عرصہ ہماری بھی واقفیت رہی ہے اس بھوت سے!''

افشاں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن خالہ بی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی بند کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہماری آج کی شام اپنے اس غیر محتاط جملے کی وضاحتوں میں گزرے گی۔ بلکہ پورے جملے کی بھی نہیں، اس میں سے ''کچھ عرصے'' کی۔ یہ نہیں تھا کہ افشاں بیگم میں حسِ مزاح بالکل نہیں تھی یا شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ ہماری فطرت اور مزاج سے ناواقف تھیں۔ بس اس موضوع کے متعلق وہ آج بھی اسی قدر چوکنا تھیں جتنا کہ آج سے بیس سال پہلے۔ کیا مجال کہ مذاق میں کہا ہوا کوئی فقرہ یا نظر کی کوئی بے پروائی انکے نوٹس میں آئے بغیر گزر جائے۔ یہاں تک کہ ہمارے لیے افشاں بیگم کے سامنے کسی ہجر زدہ شعر یا اداس نغمے سے لطف اٹھانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

جمیلہ کے بارے میں اس طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو افشاں بیگم اور خالہ بی کے درمیان تو یقیناً روز ہی ہوتی ہو گی، ہفتے میں ایک آدھ بار ہمیں بھی اس میں شامل کر لیا جاتا تاکہ ہماری دلچسپی اس معاملے میں برقرار رہے اور شکوک وشبہات اور ظن وقیاس کی تازہ ترین صورت حال سے ہمیں باخبر رکھا جا سکے۔ پھر کبھی کبھار افشاں بیگم کی کسی سہیلی یا ملنے کے لیے آنے والی کسی پڑوسن کی رائے بھی تفتیش کے پلڑے کو اور بوجھل بنا دیتی۔ گو ابھی کوئی ٹھوس ثبوت بہم نہیں پہنچایا جا سکا تھا اور جمیلہ پر لگایا گیا الزام فقط اندازوں پر مبنی تھا لیکن یہ آئے دن کے تذکرے اندر ہی اندر ہمیں قائل کرتے چلے جا رہے تھے کہ اس کے بارے میں افشاں بیگم کا خیال درست ہے اور ہمارے دل میں جمیلہ کے لیے ہمدردی کے جذبات میں کمی ہوتی جا رہی تھی۔ خاص طور پر جب کبھی شام کو وہ الٰہی بخش کے ساتھ سر جھکائے ہوئے جاتی دکھائی دیتی تو حزن وملال کے اس تاثر کی، جسے اس نے لبادے کی طرح اوڑھ رکھا تھا، واحد ذمہ دار وہ خود نظر آتی۔ پھر کبھی خیال آتا کہ یہ سب آخر ہے تو اندازوں ہی کا کھیل، کیا پتا اس کی بنیاد ہی غلط ہو۔ عورتوں کی چھٹی حس کیسی ہی تیز کیوں نہ ہوتی ہو، کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ ہی صحیح ہو۔ پھر ہم نے ایک دن الٰہی بخش کے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ سن لیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم کسی کام سے نکلے تھے۔ زیادہ دور نہیں جانا تھا اس لیے پیدل ہی گئے تھے۔ شام کو گھر لوٹ رہے تھے جب گیٹ کے پاس ہم نے سنا، الٰہی بخش کہہ رہا تھا۔

''اتنے ہی نخرے ہیں تو بھاگی کیوں تھی گھر سے۔''

اس وقت وہ دونوں واپس جا رہے تھے۔ گیٹ کے قریب ہم کمپاؤنڈ کی دیوار سے باہر تھے اور وہ اندر۔ جانے کیا بات رہی ہو گی۔ پتا نہیں جمیلہ کی کس فرمائش یا شکوے کو اس ظالم نے نخرے سے تعبیر کیا تھا۔ ہم نہ اس فقرے سے پہلے کی گفتگو سن سکے نہ بعد کی۔ کیونکہ اس

کے فوراً بعد گیٹ پر ہمارا سامنا ہو گیا۔ الٰہی بخش ہمیں دیکھتے ہی چپ ہو گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں سلام کیا۔ ہم نے دیکھا کہ جمیلہ معمول سے بھی کچھ زیادہ سہم گئی ہے۔ اس فقرے نے ہمیں بھی سن سا کر دیا تھا۔ لیکن بظاہر بے دھیانی سے الٰہی بخش کے سلام کا جواب اشارے سے دیتے ہوئے ہم اندر آ گئے۔

ہم نے افشاں بیگم سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ نجانے کیوں۔ حالانکہ یہ خبر ان کے لیے بہت دلچسپ اور ولولہ انگیز ہوتی۔ ہم اندازہ نہیں کر سکے کہ ہمیں دکھ ہوا ہے یا غصہ آیا ہے؟ اور اگر یہ غصہ ہے تو جمیلہ پر ہے یا اس کے شوہر پر۔ یعنی جس شخص کی خاطر اس لڑکی نے اپنا گھر بار، سب کچھ چھوڑ دیا، وہی اسے طعنہ دے رہا تھا۔ اور اسی بات کا! کس قدر گھٹیا شخص تھا اور کیسا برا انتخاب! افشاں ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ یقیناً جمیلہ کی عقل ہی ماری گئی ہو گی جو ایسے کے ساتھ بھاگ نکلی۔

جمیلہ کے متعلق افشاں بیگم کی اپنی، ان کی سہیلیوں کی اور خالہ بی کی آراء سے کشید کیے گئے تجزیے کچھ اتنی دلچسپی سے تو ہم پہلے بھی نہیں سنتے تھے لیکن اب تو ہمارا حصہ اس طرح کی گفتگو میں صرف ہوں، ہاں تک ہی محدود رہ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ افشاں بیگم کا جوش و خروش بھی مدہم پڑتا گیا۔ ہمارے ہاں جمیلہ کے ساتھ پہلے بھی کوئی بدسلوکی یا برا رویہ تو روا نہیں رکھا گیا تھا، لیکن اب تو اس کے بارے میں افشاں بیگم کا چوکنا پن بھی ختم ہو گیا تھا۔ اور ہمارے گھر میں لوگ ہی کتنے تھے۔ خالہ بی، افشاں بیگم اور ہم ۔۔۔ دانی ان دنوں ایبٹ آباد میں پڑھ رہا تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کبھی دوسرے تیسرے ہفتے ایک دو دنوں کے لیے آتا تھا۔ کبھی کبھار اپنے کسی دوست کو بھی لے آتا تھا۔ اس دن بھی اسکا ایک دوست اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر پہلے فون پہ بتایا تھا۔ بیٹے کے آنے کی خوشی میں افشاں بیگم کو اس کے دیر سے اطلاع دینے کی جھنجھلاہٹ بھی بھولی ہوئی تھی اور کام کاج کی پریشانی بھی۔ جمیلہ دانی کا فون آنے سے پہلے ہی گھر جا چکی تھی۔ کام کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ دانی کا کمرہ تو روز ہی صاف ہوا کرتا تھا۔ بس اس کے دوست کے لیے ایک کمرہ تیار کرنا تھا، اور کھانے کا بندوبست۔ لیکن افشاں بیگم جیسی اہتمام پسند خاتون کے لیے کوئی کام بھی نہ ایسا سادہ ہوتا ہے اور نہ اتنا آسان۔ کئی طرح کے کھانوں کی تیاری، سارے گھر کی ایک بار پھر سے جھاڑ پونچھ، اور خاص طور پر دانی اور اس کے دوست کے کمروں کی تو مکمل صفائی کی گئی۔

جو کمرہ دانی کے دوست کے لیے منتخب کیا گیا تھا اس میں کئی فالتو چیزیں پڑی رہتی تھیں جیسا کہ استعمال میں نہ آنے والے کمروں میں ہوتا ہی ہے۔ ایسی سب چیزوں کے نئے ٹھکانے بنائے گئے۔ پنکھا اور خراب استری سٹور میں رکھے گئے، دھلنے والے کپڑے بالٹی میں منتقل ہوئے اور پرانے اخبار ردی کے ڈھیر میں۔ اخبار ہمارے ہاں جس باقاعدگی سے پچھلے کئی سالوں سے آ رہا تھا، اس باقاعدگی سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔ بس جتنی دیر میں ناشتہ ہوتا موٹی موٹی سرخیاں دیکھ لی جاتیں اور ایک آدھ اداریہ پڑھ لیا جاتا، پھر سارا دن وہ اسی میز پر لاوارث پڑا رہتا اور شام کو بڑے سلیقے سے تہہ کر کے تاریخ وار ترتیب سے رکھ دیا جاتا۔ افشاں بیگم ہمیں وہی سلیقے سے رکھے ہوئے اخبار ردی کے ڈھیر میں ڈالنے کے لیے دے رہی تھیں جب وہ ہمارے ہاتھ سے گر کر فرش پہ بکھر گئے۔ ہم اخبار اٹھانے کو جھکے تو نگاہ ایک تصویر پہ

جم گئی۔ چند ماہ پہلے کے ایک اخبار کا درمیان والا صفحہ ہمارے سامنے کھلا ہوا تھا۔ یہ جمیلہ تھی۔ بغیر کسی شک وشبہ کے۔ ساتھ ہی دوسری تصویر میں مضافات کے کسی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر ایک ٹرین کھڑی تھی جسکے گرد لوگ جمع تھے۔ نیچے لکھا تھا:

''پیار کی کہانی کا دردناک انجام۔۔۔''

''لڑکا پہلے ہی سٹیشن پر گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک۔ گھر سے بھاگ کر آنے والی دوشیزہ لا پتا۔''

ہم نے تفصیل پڑھنے کے لیے اخبار اٹھایا تو سطریں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہونے لگیں۔ ہم نے اخبار ساتھ کھڑی ہوئی افشاں بیگم کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگے۔

 

مورصاحب

مورصاحب کی زندگی میں لے دے کر دو ہی چیزیں رہ گئی تھیں۔ایک اپنی بیوفا بیوی کی یاد اور دوسری شراب! ان دونوں کا آپس میں تعلق تھا تو کچھ علت اور معلول ہی کا لیکن یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے علت کون ہے اور معلول کون؟ بیوی کی یاد اسے شراب خوری کی طرف مائل کرتی تھی یا پھر شراب کا نشہ یادوں کا وہ دروازہ کھول دیتا تھا جس سے ایلزبتھ کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل اس کے لیے مورصاحب کی نفرت میں اضافہ کرتا چلا جاتا تھا۔مورصاحب کو ایلزبتھ سے شدید محبت تھی۔ یہ نفرت اسی محبت کا ایک رخ تھا۔ وہ ہمیں اکثر اسکے قصے سناتا رہتا تھا جو جہاں کہیں سے بھی شروع ہوتے ہوں ایک سرے سے اسکی بیوفائی کے ساتھ بندھے ہوتے تھے۔ یہ شاید کچھ ایسی بیوفائی بھی نہیں تھی۔ بات اتنی تھی کہ پارٹیشن کے بعد ایلزبتھ نے مور کے ساتھ پاکستان میں رہنے کی بجائے وطن واپس جانے کو ترجیح دی تھی۔اسے یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ مورصاحب نے اسکے ساتھ انگلینڈ جانے کی بجائے یہیں پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔مور صاحب کے پاس اپنے فیصلے کے حق میں کئی وجوہات تھیں۔ایلزبتھ کا موقف ہمیں معلوم تو نہیں لیکن ہم اسکا اندازہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ لیکن بات اتنی سادا بھی نہیں تھی۔ مارک کا کردار اس قصے کو پیچیدہ بناتا تھا۔مارک ایلزبتھ کا کزن تھا جو مور اور ایلزبتھ کی طرح تاجِ برطانیہ کی ملازمت میں یہاں برِصغیر میں مقیم تھا۔آزادی کے بعد جہاں مورصاحب نے یہیں رہ جانے کا فیصلہ کیا وہاں ایلزبتھ نے مارک کے ساتھ واپس چلے جانا مناسب سمجھا۔گزرتے وقت کے ساتھ مورصاحب کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا کہ ایلزبتھ کے واپس جانے کے فیصلے میں مارک کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ تھا۔اور یہی وہ خیال تھا جس نے رفتہ رفتہ انا کے اس معاملے کو محبت میں ناکامی کا رخ دے دیا تھا اور مورصاحب کے غم میں غصہ کا رنگ بھی گھول دیا تھا۔کولونیل راج کی طرف سے ملنے والے تمام اعزاز اور میڈل وہ ٹھکانے لگا چکا تھا فقط ایک خنجر اس نے سنبھال رکھا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ کسی دن اسی خنجر سے وہ ایلزبتھ کا مرڈر کرے گا۔

مورصاحب کو لاہور میں تقریباً ۴۵ سال ہو گئے تھے۔ وہ جب برطانیہ سے یہاں آیا تھا تو صرف ۲۳ سال کا تھا۔تقسیم سے پہلے کے ۳۰ سال اسنے ملکہ کی نوکری کی۔ برِصغیر آزاد ہوا تو حکومتِ پاکستان کی خواہش پر کچھ لوگوں کی خدمات اسکے سپرد کر دی گئیں۔ باقی میں سے جن کی ملازمت کی زیادہ مدت ابھی باقی تھی انہیں واپس بلا لیا گیا اور جو لوگ اپنی ریٹائرمنٹ کے قریب تھے انہیں پینشن اور بونس کی پیشکش کی گئی۔ برطانیہ واپس جانا یا پاکستان ہی میں رہنا انکا اپنا انتخاب تھا۔مورصاحب نے یہیں رہنا منتخب کیا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''میں اوسموسس کے ذریعے مسلمان ہو گیا ہوں۔'' اس سے اسکی مراد شاید پاکستانی ہونا تھا۔

میں اسکے ملازمت کے دنوں کا ساتھی تو نہیں تھا لیکن لگتا یوں تھا کہ جیسے ساری زندگی اسی کے ساتھ بتائی ہو۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن ظاہر میں مور صاحب میں شراب نوشی اور غصے کی تیزی کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر خرابی نہیں تھی۔ یوں تو یہ دو خرابیاں ہی پورے کے پورے انسان کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہیں لیکن مور صاحب ایک ہمدرد انسان تھا۔ غصہ جلد آتا تھا تو جلد ہی اتر بھی جاتا تھا۔ ایک اپنی بیوی کے سواوہ کسی کو بھی آسانی سے معاف کر سکتا تھا۔ انگریزوں والی نخوت اور لئے دیے رہنے کی عادت اس میں اگر تھی بھی تو ایسی نمایاں نہیں تھی۔ بلکہ اس لحاظ سے وہ بڑی حد تک واقعی پاکستانی تھا۔ جذباتی، بے تکلف، جلدی دوست بن جانے والا اور مقدور بھر دوستی نبھانے والا۔ پینٹ کوٹ صرف تبھی پہنتا تھا جب کبھی کبھار چرچ کی یاد آ جاتی یا پھر کسی ملاقاتی پر رعب ڈالنے کے لئے، ورنہ عام طور پر شلوار قمیص میں ہی رہتا تھا۔ کہتا تھا شلوار قمیص پہننے والے کو وزن کے بڑھنے کا احساس نہیں ہوتا ہے جو کہ خود وزن سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ یوں بھی اس جیسے ڈھیلے ڈھالے، سہل پسند آدمی کے لیے کوٹ پتلون کی مشقت مناسب نہیں تھی۔ وہ ان انگریزوں میں سے نہیں تھا جو اپنی زندگی ہمیشہ ڈسپلن اور روٹین کے شکنجے میں کسے رکھتے ہیں۔ نہ اخبار یا ریڈیو کی لت، نہ صبح کی سیر، نہ سہ پہر کی چائے کی باقاعدگی، نہ کلب اور نہ ہی گالف یا بلئیرڈ کے سے کسی کھیل کا نشہ۔ نشہ تھا تو بس وہی سچ مچ کا نشہ: شراب کی عادت۔

ان دنوں محمد نگر میں بہتیرے گورے اور یوریشینز رہتے تھے۔ ہیٹ اور چھڑی کی پابندی کے ساتھ واک کرتے ہوئے بوڑھے انگریز، سڑک کے اطراف بنے ہوئے گھروں کی بالکونیوں میں وائیلن بجاتی، جھومتی گاتی لڑکیاں، ٹولیوں میں پھرتے یانکیز، سائیکلوں پہ گھومتے، ناراضگی کے اظہار کے لیے ٹوٹی پھوٹی انگلش پر وئی اردو بولنے کا موقع ڈھونڈتے دیسی عیسائی۔ یہ وہ مناظر تھے جو ریلوے سٹیشن سے کینٹ کی طرف آتے ہوئے کیرن ہوسپٹل سے آگے نکلتے ہی دائیں طرف کی سڑک مڑنے کے بعد آپ کو نظر آنے لگتے تھے۔

یہ سڑک کچھ زیادہ چوڑی اور بہت کمال کی بنی ہوئی تو نہیں تھی لیکن خوبصورت تھی۔ دونوں اطراف گھاس کے بے قاعدہ قطعے اور کہیں کہیں ایستادہ سفیدوں میں بھی ایک گونہ ترتیب تھی۔ انہی قطعوں اور درختوں میں سے گزرتی ہوئی اس سڑک کی شاخیں اور انکے کناروں پہ بنے ہوئے کاٹیجز گورا کالونی بناتے تھے۔ ان کاٹیجز کے باسی اکثر اپنی اپنی دنیا میں مگن لوگ تھے۔ انہی دنیاؤں میں سے ایک مور صاحب کی تھی۔۔۔اور ہماری بھی! تین کمرے، دو باتھ اور ایک کچن کا یہ مکان ہمیشہ اپنی گنجائش سے زیادہ آباد رہتا تھا۔ اکثر ہم میں سے کسی کا کوئی دوست رشتہ دار جو کسی دوسرے شہر یا مضافات سے کسی سلسلے میں لاہور آیا ہوتا تھا، یہاں مہمان بنا رہتا تھا۔ ہمیں خود بھی کبھی کبھار اس سہولت کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ حامد تو ایک دفعہ پورے چھ ماہ مور صاحب کا مہمان بنا تھا۔ ان دنوں وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس کر رہا تھا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد سیدھا کلاس لینے چلا جاتا، شام کو جب فارغ ہوتا تو شاد باغ کی آخری بس کب کی جا چکی ہوتی۔ مور صاحب کا گھر قریب تھا چنانچہ حامد وہیں پڑ رہا۔ پھر جب میری نائیٹ ڈیوٹی لگی تھی تو ایک مہینہ میں بھی مور صاحب کے ہاں ہی رہا تھا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میری رات کی شفٹ تبدیل ہی مور صاحب نے کروائی تھی ورنہ میرے سپروائیزر نے تو اپنے ایک لاڈلے کو صبح کی

شفٹ دینے کی خاطر میری پکی نائیٹ لگا ہی دی تھی۔اس دن مور صاحب صبح سویرے میرے ساتھ میری کمپنی کے دفتر گیا۔وہ ان دنوں میں سے ایک دن تھا جب مور صاحب نے خوب دھیان سے شیو کی، خوشبو لگائی اور اپنا پسندیدہ سوٹ زیب تن کیا۔رنگ روپ تو نسلی ہی تھا، قد بدن بھی برا نہیں تھا۔بس ڈھیلی ڈھالی زندگی اور کھانے پینے، خصوصاً پینے کی بے احتیاطیوں نے فربہی میں اضافہ کر دیا تھا اور اچھے خاصے ا کھرے نقوش کو دوہرا دیا تھا۔

میرا سپروائیزر پرویز، المعروف پیجی بھیا بہت زبان دراز تھا لیکن اس دن وہ اپنی ساری تیزی طراری بھول گیا۔ پہلے تو مور صاحب کی شخصی وجاہت کے رعب نے ہی اسکے سارے کس بل نکال دیے۔اوپر سے انگریزی میں گفتگو، جس میں پیجی بھیا کا حصہ بس : ڈونٹ وری صاحب، یو جسٹ آرڈر می صاحب، اور نو کمپلینٹ ان فیوچر، رہا۔ پیجی بھیا کو فقط یہی سمجھ میں آیا کہ اس نے اگر فوراً ہی میری ڈیوٹی نہ بدلی تو بات بہت اوپر تک بھی جا سکتی ہے۔بس پھر اس دن کے بعد سے پیجی بھیا نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔

مور صاحب کا یہ انگریزی رعب ایک بار شبیر کے بھی کام آیا تھا جب اسے علاقے کے ایس ایچ او نے ستانا شروع کر دیا تھا۔ زمین کے جھگڑے میں اسکے مخالف نے اپنی واقفیت استعمال کی اور ایک تھانیدار صاحب بات بے بات شبیر کو تھانے بلانے لگے۔غیر ضروری جرح، غیر متعلق واقعات کے بارے میں سوالات اور کہیں کہیں دھونس اور دھمکی بھی۔شبیر یوں ڈر جانے والا تو نہیں تھا لیکن آئے دن تھانے کی طلبی محلے میں اسکی شہرت کے لیے، جیسی کیسی بھی وہ تھی، کچھ اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ ایک شام مور صاحب کے ہاں تاش کھیلتے ہوئے شبیر نے اپنی الجھن کا ذکر کر دیا۔مور صاحب نے کچھ اپنی تشفی کے لیے انگریزی میں اور کچھ شبیر کی تسلی کی خاطر اپنی معلومات کے بقدر اردو اور پنجابی میں اس تھانیدار کو اور شبیر کے مخالف کو گالیاں دیں اور اگلے ہی دن تھانے بھی تشریف لے گیا۔اس ملاقات کی خاطر خاص طور پر اس نے معزز نظر آنے کا اہتمام کیا تھا تا کہ اگر پانسہ الٹا پڑ جائے تو کہیں تھانیدار اسی کو نشہ میں دھت ہونے کے الزام میں بند نہ کر دے۔لیکن مور صاحب کا نشانہ کم ہی خطا ہوتا تھا۔تھانیدار تو فوراً ہی بھیگی بلی بن گیا بلکہ گمان غالب ہے کہ اس نے شبیر کے اس مخالف کو بھی ضرور لتاڑا ہوگا کیونکہ اس کے بعد سے اس نے بھی شبیر کو کبھی تنگ نہیں کیا۔

مور صاحب کے ہاں رہنا خاصا دلچسپ تجربہ ہوتا تھا۔ایک تو اسکا اقتصادی پہلو تھا۔ہم سب محدود آمدنیوں والے لوگ تھے اور کسی ہوٹل میں چند دن کے لیے بھی ٹھہرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔مور صاحب کے گھر رہنے میں کسی قسم کے کوئی اخراجات نہیں اٹھانے پڑتے تھے۔ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی نشے کی حالت میں چاہے تو وہ پائی پائی کا حساب بتا سکتا تھا۔مور صاحب کے گھر میں دن رات کا کوئی فرق نہیں تھا۔فرج میں جو کچھ موجود ہے آپ جب جی چاہیں نکال سکتے ہیں، پکانا آتا ہے تو خود پکائیں اور کھائیں اور دن رات میں کسی بھی وقت اٹھ سکنے والے غل غپاڑے یا شور کھٹکے سے لاتعلق ہو کر کسی صوفے، دیوان یا بستر پہ پڑ کر جتنی دیر سو سکتے ہیں سوتے رہیں اور روشنیوں کے جلنے بجھنے یا جلتے رہنے سے پریشان نہ ہوں۔

مور صاحب کی زندگی میں عام انگریزوں کی طرح کوئی ترتیب یا تنظیم نہیں تھی۔ نہ تو وہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرتا تھا اور نہ ہی دوسروں سے اسکی توقع رکھتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ آدھی رات کو وہ آپ کو نیند سے جگا کر وہ خط سنانا شروع کردے جو اسنے اپنی بیوی کو لکھے تھے لیکن کبھی بھیجے نہیں تھے یا پھر اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتے کرتے رونے لگے۔

جی ہاں مور صاحب کی ایک بیٹی بھی تھی۔ کیتھرین انگلینڈ میں ہی رہتی تھی لیکن ماں سے الگ۔ وہ اکثر باپ کو خط لکھتی تھی، کبھی کبھی کچھ رقم بھی بھیج دیتی تھی۔ اسکے خطوط اور تصاویر مور صاحب بہت سنبھال کے رکھتا تھا۔ کیتھرین کی خواہش تھی کہ مور صاحب اسکے پاس انگلینڈ آجائے تاکہ وہ اسکا اچھی طرح خیال رکھ سکے۔ اپنے خطوں میں وہ اس خواہش کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ اسے اپنے باپ سے بہت محبت تھی لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بہر حال نہیں کہ وہ اسکی خاطر یہاں پاکستان آجاتی۔ لگی لگائی نوکری، دو بچے جن کے باپ کے ساتھ اسکی علیحدگی ہو چکی تھی، لیکن بچوں کے توسط سے ملاقات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی رہتی تھی، ایک اپارٹمنٹ۔ یہ سب اسے زندگی کا وہ کمفرٹ زون مہیا کرتے تھے جسے چھوڑنا اسکے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ ہاں، جس فاصلے اور زاویے سے وہ اپنے باپ کو دیکھتی تھی اسے وہاں کوئی حلقہءآسودگی یا کمفرٹ زون سرے سے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ چنانچہ اسکے نزدیک مور کا پاکستان کو چھوڑ کر اسکے پاس چلے آنا نہ صرف یہ کہ کوئی مشکل نہیں تھا بلکہ عین مناسب تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ مور صاحب کے لئے اب وہ انگریزی معاشرہ ایسا ہی اجنبی ہو چکا تھا جیسا کہ خود کیتھرین کے لئے پاکستان۔ اور یہ نہ سمجھ سکنے میں وہ حق بجانب بھی تھی۔ مور صاحب اب گوری رنگت والا ایک ایسا پاکستانی بوڑھا تھا جس کو اپنی عمر اور اونچے گھرانے کی وجہ سے محلے کا بڑا ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ سب ہمسائے جس کی چڑچڑی طبیعت اور کمینی عادتوں کا مذاق تو اڑاتے ہوں، اسکے غصے سے بھی کچھ نہ کچھ ڈرتے ہوں لیکن دل ہی دل میں اسکا احترام بھی کرتے ہوں اور مشکل وقتوں میں اسکا سہارا بھی ڈھونڈتے ہوں۔ ہم اسکے محلے دار تھے، جغرافیائی اعتبار سے نہ سہی۔۔۔ لیکن تھے ہم اسکے محلے دار! اور محلے دار صرف سہارے ڈھونڈتے نہیں، ضرورت کے موقعوں پر سہارا دیتے بھی ہیں۔ جب کچھ برس ادھر مور صاحب کو نمونیہ ہوا تھا، اور اسکے اپنے محبوب اور مستعمل نسخے برانڈی سے بھی آرام نہیں آیا تھا تو ہم اسے ٹانگے میں ڈال کر کیرن ہسپتال لے گئے تھے جہاں اسے داخل کرلیا گیا تھا۔ ٹیکے دوائیاں تو ہسپتال سے ہی مہیا کی جارہی تھیں لیکن اسکی خوراک کا خاص خیال رکھنے میں ہم بہت چاق چوبند رہے۔ سوپ، یخنی، دلیہ، کھچڑی، ہم میں سے ہی کسی نہ کسی کے گھر سے بن کے جاتا تھا۔ ظفر تو محلے کے مولوی صاحب سے پانی بھی دم کروا کے لاتا رہا۔ باری بدل بدل کر ہم اسکے ساتھ ہسپتال میں ہی رہتے تھے۔ ایک آدھ دن تو مور صاحب نیم بیہوشی کی سی حالت میں رہا۔ ہوش میں آتے ہی اسے شراب کی طلب ہوئی۔ چنانچہ کہیں نہ کہیں سے شراب مہیا کرنا اور ہسپتال میں پہنچانا بھی ایک معرکہ تھا جو ہم نے کسی نہ کسی طور انجام دیا۔

مور صاحب ہمارا دوست نہیں تھا، وہ ہم سب دوستوں کی قدرِ مشترک تھا، ہمارا مرکزی نکتہ تھا۔ اسکی اپنی زندگی کا محور وہ نفرت تھی جو اسکا اصرار تھا کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ تھی، یا پھر بیٹی کی محبت! اور محبت اور نفرت کی اس بھٹی کو دہکائے رکھنے کے لیے اسے ہر وقت

شراب چاہیے تھی۔اسکی تقریباً تمام کی تمام پینشن اسی پہ خرچ ہو جاتی تھی۔اسکے اور اخراجات بھی کیا تھے۔اکیلا آدمی تھا،پینشن کی رقم میں اچھا کھانا پینا اور بجلی گیس وغیرہ کے بل آسانی سے بھگت جاتے تھے۔موسم کے کپڑے اسکی بیٹی اسے ہر سال بھیج دیتی تھی۔یا پھر بھان متی کے اس کنبے کے چائے پانی اور کبھی کبھی کے کھانے کا خرچ تھا جس میں شامل تھے ہم۔۔۔مور صاحب کا دیسی خاندان!

یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ وہ ہمارا بہت خیال کرتا تھا کیونکہ وہ سب سے زیادہ اپنا ہی خیال رکھتا تھا۔وہ ایک روایتی خودغرض،اور خود میں مگن انگریز تو نہیں تھا لیکن اسکے دن کے تمام معمولات،اسکے سارے کام،سب فیصلے اسکی اپنی مرضی اور ترجیحات کے مطابق ترتیب پاتے تھے اور سرزد ہوتے تھے۔اس ترتیب کو خراب کیے بغیر،اسکی ترجیحات میں مخل ہوئے بغیر ہم اسکے گھر میں رہیں،آئیں جائیں،کھائیں پیئیں،اسے کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ کسی حد تک اس کمپنی سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔اخراجات کی اسے پروا نہیں تھی،نہ ہماری وجہ سے ایسا کوئی بڑا فرق ہی پڑتا تھا۔اسے اپنے کسی کام سے جانا ہوتا تھا تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ساتھ ہوتا تھا۔اس دن کام سے چھٹی ہوتی۔ کبھی گھر میں کسی چھوٹی موٹی مرمت کی ضرورت ہوتی تو ہمیں میں سے کوئی نہ کوئی خود ہی کوشش کرتا یا کسی مکینک کا بندوبست کرتا۔ایک دفعہ تو جب پانی کی ٹینکی لیک ہوگئی تھی اور صفائی اور مرمت کی غرض سے پانی دو دن بند رہا تھا تو ہم ہی گھر اور دفتر سے بوتلوں میں پانی بھر بھر کے لاتے رہے تھے۔

مور صاحب کو کچھ ایسا سامان جمع کرنے کا شوق بھی نہیں تھا۔اسکے پاس ایک پرانا سا گراموفون تھا جس پر وہ گلین ملر اور جمی ڈورسی کے ریکارڈ سنتا تھا لیکن صرف تب جب اسے اپنے وطن کی یاد بہت بے چین کر دیتی تھی۔ایسے موقعوں پر وہ ایک خالص بے مروت انگریز کی طرح ہم سے صاف کہہ دیتا،آئی وانٹ ٹو بی الون جنٹلمین،یو مے لیو ناؤ! (I want to be alone gentlemen, you may leave now)،یا پھر ایک بڑا سا دو بینڈ کا ریڈیو تھا جس پر وہ موسم کی خبریں سنتا تھا۔وہ خنجر جو ایلزبتھ کے ممکنہ قتل کے آلے کے طور پر مور صاحب نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا اسے کسی وائیسرائے یا گورنر نے کبھی خدمات کی بہتر بجا آوری کے صلے میں عطا کیا تھا،اور جوتے کے ایک خالی ڈبے میں تاریخ وار ترتیب سے رکھے ہوئے بیٹی کے خط تھے۔

مور صاحب کی ساری زندگی میں اگر کہیں کچھ ترتیب و سلیقہ نظر آتا تھا تو وہ انہی خطوط کے سنبھالنے میں تھا۔کسی خط کا کوئی لفافہ تک ضائع نہیں ہوا تھا۔اور کیتھی کے خطوط ایسے ہی نفیس ہوا بھی کرتے تھے۔عمدہ کاغذ،دونوں طرف برابر کا حاشیہ،صاف رواں تحریر،برابر کی تین تہوں میں تہہ کیا ہوا صفحہ۔موسم کے حال اور گردوپیش کے حالات کا ذکر اور باپ سے لندن چلے آنے کا تقاضا تقریباً ہر خط کا مضمون ہوا کرتا تھا۔ماں کا ذکر اس نے کبھی نہیں کیا۔شاید دونوں ماں بیٹی کا رابطہ نہیں تھا یا پھر ہو سکتا ہے وہ باپ کو ماں کے ذکر سے آزردہ نہ کرنا چاہتی ہو۔

کیتھی اکثر اپنے بچوں کی تصویریں بھیجتی رہتی تھی جن میں سے کچھ تو مور صاحب نے فریم بھی کروا رکھی تھیں۔کبھی کبھی مور صاحب ہمیں اپنی ملازمت کے دنوں کے واقعات بھی سنایا کرتا تھا۔کرکٹ کی کچھ ایسی کہانیاں جو کبھی کسی رسالے میں نہیں چھپی تھیں،

گورے حکمرانوں اور دیسی وفاداروں کے قصے۔۔لیکن ہر کہانی کا ایک سرا جانے کیسے کہیں نہ کہیں جا کر اسکی بیوی کے تذکرے سے جڑ جاتا تھا۔پھر یہ تذکرہ کہانی کے حاشیے سے اٹھ کر پوری کہانی کی جگہ لے لیتا۔

مور صاحب کبھی کبھی ہمیں نصیحت بھی کرتا تھا۔ایسا بہت کم ہوتا تھا۔لیکن اگر وہ کوئی نصیحت کرتا تھا تو پھر اسکا پیچھا بھی کرتا تھا،اور اس پر عمل کی راہ بھی آسان بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔اسکے مشورے برسوں کا تجربہ،عقل اور خلوص لیے ہوتے اور ہمیشہ مفید ہوتے۔ ظفر کو آگے پڑھنے کے لیے اسی نے کہا تھا۔مور صاحب اگر اسے راغب نہ کرتا تو شاید وہ کبھی ایف اے سے آگے نہ بڑھتا اور نہ ہی اسکو ملازمت میں وہ ترقی نصیب ہوتی جو تعلیمی مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ملتی چلی گئی۔پھر ایک وقت آیا کہ شہر کے مضافات سے کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں آنے والا یہ لڑکا جو اپنی تعلیمی استعداد کے بارے میں بالکل مایوس ہو چکا تھا،ایک قابلِ ذکر تعلیمی ادارے میں اپنے شعبے کا سربراہ تھا۔۔۔اور شہر کا ایک جانا پہچانا انٹلیکچوئیل!لیکن یہ سفر نہ مختصر تھا اور نہ آسان۔اس راستے میں کئی مشکل موڑ بھی آئے اور کئی لوگوں کی مدد،حوصلہ افزائی اور رہنمائی ظفر کے لیے چراغِ راہ بنتی رہی۔ان لوگوں میں ہم دوستوں کے نام بھی آئیں گے جنہوں نے کئی موقعوں پہ دامے،درمے،سخنے اسکی ہمت بندھائی۔ظفر کے خالو بھی ان میں شامل ہیں جنہوں نے اسے سب سے پہلی ملازمت لے کر دی،اور جب تک بھی وہ رہا،اسے اپنے گھر میں رکھا۔لیکن ظفر کی اس کہانی میں شاید سب سے نمایاں نام مور صاحب کا تھا۔اگر مور صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو ظفر شاید ساری زندگی محکمہء مال میں ایک جونیئر کلرک سے سینئیر کلرک تک کے سفر میں کاٹ دیتا۔اسے پڑھنے اور پھر پڑھتے رہنے کے لیے راغب کرنا،مضامین کے انتخاب میں اسکی راہنمائی کرنا،وقتاً فوقتاً اسکے گرتے ہوئے اعتماد کو سہارا دینا، یہ سب کچھ مور صاحب نے کیا اور اس غیر محسوس طریقے سے کیا کہ ظفر کو کیا،ہم میں سے کسی کو بھی کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ مور صاحب کسی معاملے میں اپنی رائے مسلط کر رہا ہے۔

وہ صرف اپنی مختصر سی گفتگو میں ایک آدھ فقرے سے خیال کی ایک پھلجھڑی چھوڑ دیتا تھا اور پھر کبھی کبھی پیشرفت کی خبر گیری کرتا رہتا تھا۔اس سے زیادہ مور صاحب سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔لیکن وہ شاید اسکی بات میں شامل خلوص ہوتا تھا یا زندگی کے تجربے اسکے مشورے کی قدر و قیمت بڑھا دیتے تھے یا پھر اسکی شخصیت کا رعب داب اسکی بات میں وہ وزن ڈال دیتا تھا کہ لوگ اسکا کہا مان لیتے تھے۔لیکن یہ سنجیدگی اور ہوشمندی کے لمحے کم ہی ہوتے تھے مور صاحب کی زندگی میں۔پھر ہوشمندی کے ان اوقات میں بھی زیادہ تر تو مور صاحب لیے دیے ہی رہنا پسند کرتا تھا۔ورنہ اسکی گفتگو کا زیادہ تر حصہ،کافی زیادہ حصہ تو وہی بیٹی کی محبت میں بھیگی ہوئی اور بیوی سے نفرت میں سلگتی ہوئی باتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔کبھی کبھی تو محبت اور نفرت کی یہ دو رخی تلوار ایسی تیز دھار ہو جاتی کہ سننے والوں کے کلیجے بھی کاٹنے لگتی۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ مور صاحب جو انگلینڈ نہیں جاتا تو اسکی وجہ اسکی کم ہمتی یا برسہا برس کی دھول نہیں ہے جو اسکے ارادوں پر جم گئی ہے بلکہ شاید اسلئے کہ وہ خود اپنی محبت یا نفرت کی شدت سے خوفزدہ تھا۔اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنی برسوں کی جمع کی ہوئی جذبات کی راکھ

سے اپنی بیٹی کی ایک ڈھرے پر چلتی ہوئی زندگی میں دھول نہ بھر دے۔

لیکن کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا تھا کہ جب بیٹی کی محبت اور نواسوں کو دیکھنے کی خواہش، انہیں پیار کرنے کی تڑپ اتنی طاقتور ہو جاتی تھی کہ لگتا تھا جیسے مور صاحب اب چلا ہی جائیگا۔ ایسا ہی ایک وقت تھا جب مور صاحب نے انگلینڈ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کیتھی نے اسے انگلینڈ کا ٹکٹ بھیجا تھا۔ شاید یہی بات مور صاحب کے خیالات میں انگلینڈ جانے کے حق میں قدرے زیادہ سنجیدگی لانے کا باعث بنی تھی۔ اس ایک وجہ کے علاوہ ایک اور امر بھی تھا جو شاید کچھ زیادہ قابلِ ذکر تو نہیں ہے لیکن مور صاحب کے ساتھ رہتے رہتے ہماری نظر میں ایک گونہ اہمیت اختیار کر گیا تھا، اور وہ یہ ہے کہ تین دنوں سے مور صاحب کو شراب کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں ہو سکا تھا۔ اور مور صاحب کے لیے کسی ایسی جگہ رہنا عذاب تھا جہاں شراب نہ ملتی ہو۔ حکومت کی تبدیل شدہ پالیسی نے شراب کا حصول تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ اگر کچھ مخصوص جگہوں سے ملتی بھی تھی تو تین گنا بڑھے ہوئے نرخوں پر! ہفتہ دو ہفتے میں ہی اسکے پاس جو پیسے تھے سب لگ گئے۔ ہم بھی اس سلسلے میں اسکی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ ایک آدھ بوتل کی تو اور بات تھی لیکن اسکی دن رات کی بیخودی کا انتظام کرنا اور کرتے چلے جانا ہمارے بس سے باہر تھا۔ یوں بھی ان دنوں قرقی تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ہم سب ہی کے ہوش اڑا رکھے تھے۔ ظفر کے مالی حالات کچھ بہتر تھے لیکن اسے ان دنوں اپنی پڑی ہوئی تھی۔ مور صاحب ہی کے حوصلہ دلانے پر اس نے ایک بین الاقوامی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے درخواست بھیجی تھی۔ وہ منظور ہوگئی۔ اب اسے داخلے کی فیس کا بندوبست کرنا تھا۔ وقت بہت کم تھا ورنہ دفتر سے ایڈوانس ہی مل جاتا۔ مالی مشکلات کے اس دور میں مور صاحب کی شراب کا انتظام کہاں سے ہوتا۔ چنانچہ نشے کے ساتھ ساتھ مور صاحب کے اپنے وطن واپس جانے کے ارادوں پر جمی ہوئی دھول بھی کچھ اترتی جا رہی تھی۔

اس رات بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ مجھے گڑھی شاہو سے آگے جانے کے لئے سواری نہ ملی تو میں مور صاحب کے گھر آ گیا۔ ان دنوں میں ریڈیو پاکستان میں کام کرتا تھا اور میری ڈیوٹی رات کے دس بجے ختم ہوتی تھی۔ مور صاحب نے اکھڑے ہوئے نشے کی بیزاری کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ وہ دیوان پر نیم دراز کوئی پرانا رسالہ دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے سونے کے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر رہا تھا جب مور صاحب نے اچانک رسالہ بند کیا اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ جتنی اس سے متوقع نہیں تھی، اٹھ کر کیتھی کے خطوط والا ڈبہ کھولا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اسنے کیتھی کا آخری خط اٹھایا، اسے کھول کر اسکے اندر رکھا ہوا پی آئی اے کا ٹکٹ نکالا، اسے غور سے دیکھ کر جیب میں رکھا اور مجھ سے کہا:

''تم ابھی ائیر پورٹ چلے گا، میرے ساتھ۔''

''اس وقت؟'' میں نے احتجاج کیا۔ ''اتنی بارش میں؟''

''بلڈی بارش کیا کہتا، ابھی جائیں گا۔''

''لیکن ابھی کیا ضرورت ہے؟ صبح چلے جائیں گے۔'' مجھے پتہ تھا کہ ٹکٹ کی تاریخ میں ابھی بہت دن باقی ہیں اوراگر وہ سیٹ کنفرم کرنا چاہتا ہے تو ضروری نہیں کہ آدھی رات کو بارش میں بھیگتے ہوئے جائیں۔ مور صاحب نے جواباً صبح کو بھی ایک گالی دی اوراپنی برساتی پہننا شروع کر دی۔ اس نے مجھے چھتری تھمائی اور کہا:

''گواینڈ گیٹ اے ٹو نگا،۔۔۔۔اور ہاں سالم۔''

کچھ ہی دیر میں ہم لاہور کی سنسان سڑکوں پر، ٹانگے میں بیٹھے، بارش کی تیز بوچھاڑ میں کچھ بچتے کچھ بھیگتے ہوئے ائیر پورٹ کی طرف رواں تھے۔ راستے بھر مور صاحب نے کوئی بات نہ کی۔ میرا دماغ سن تھا۔ مجھے ہمیشہ اندر ہی اندر یہ یقین رہا تھا کہ مور صاحب پاکستان چھوڑ کر کبھی نہیں جائیگا۔ پتہ نہیں یہ اس یقین کے ٹوٹنے کا دکھ تھا یا مور صاحب کے اس فیصلے کے اچانک پن نے مجھے ماؤف سا کر دیا تھا۔ ہم ائیر پورٹ پہنچے تو مور صاحب نے مجھے ٹانگے ہی میں بیٹھے رہنے کے لئے کہا اور خود عمارت کے اندر چلا گیا۔ بارش کا زور اس وقت تک بہت حد تک ٹوٹ چکا تھا۔ میں ایک سگریٹ سلگا کر اسکا انتظار کرنے لگا۔ اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ واپس آیا تو اسکا چہرہ معمول سے کچھ زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے اس وقت تک مستقبلِ قریب میں پیش آنے والی مور صاحب کی جدائی اور اپنی زندگی میں اسکی کمی کو کچھ نہ کچھ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

''چلو بوئے!'' اس نے ٹانگے میں بیٹھتے ہوئے ایک لفافہ مجھے تھمایا: ''یہ کل ظفر کو دے دینا۔ اٹس ہز ایڈمشن فی (It's his admission fee)، اوراب ہم ملواری بار پر جائیں گے، او بوئے، ہم پورا کریٹ خریدے گا۔ میں نے ٹکٹ بیچ دیا ہے۔''



ناتمام

پتہ نہیں یہ کہانی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے دن اس میٹنگ میں رختاج کے آنے سے۔اپنے پاؤں اپنی نشست پر سمیٹ لینے سے، دوسرے دن حمید کے ساتھ آبیٹھنے سے، یا پھر کچھ ہی دیر بعد اٹھ جانے سے۔ یا شاید بات وہاں سے شروع ہوئی جب حمید نے اپنی دوسری جانب بیٹھے ہوئے ساتھیوں کے طعنے سن کراس سے اس کے اٹھ جانے کا گلہ کیا اور اگلے دن وہ پھر حمید کے پاس آ بیٹھی۔ سب نشستوں کے سامنے میز پر شرکاء کے ناموں کے کارڈز موجود تھے۔ایک شہر سے آنے والے ایک ساتھ بٹھائے گئے تھے۔ حمید کے ساتھ بائیں ہاتھ فیصل کی کرسی تھی۔ میٹنگ کے دوسرے دن فیصل دیر تک نہیں آیا اور وہ خوبصورت لڑکی اس کی جگہ آبیٹھی تو دوسری طرف بیٹھے مختار اور نادیہ نے حمید کے کان میں خوب پھوں پھاں کی۔ فیصل آیا تو وہ اٹھ گئی۔ اب ان دونوں نے بغلیں بجائیں اور مختار نے تو سرگوشی کی: ''بھائی جی، سوہنی کڑی تہاڈے نال زیادہ دیر نئیں کڈ سکدی۔'' چائے کا وقفہ ہوا تو حمید پیالی اٹھائے سیدھا رختاج کے پاس جا پہنچا۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس وقت تک حمید اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

''مس، آپ نے بڑی زیادتی کی میرے ساتھ!''

''جی۔۔!'' وہ حیرانی سے بولی۔

''دیکھیے، میٹنگ کی سب سے خوبصورت لڑکی میرے پاس آ کر بیٹھی۔ میرے دوست جل کے راکھ ہو گئے۔ اور ابھی میں پوری طرح خوش بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اٹھ گئی۔ یا تو آپ آتی ہی نہ، اور یا پھر بیٹھی رہتیں۔ اب وہ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔''

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اب میں باقی سارا وقت آپ کے ہی پاس بیٹھوں گی۔''

نہیں، بات وہاں سے بھی شروع نہیں ہوتی، کیونکہ باوجود اس کے کہ حمید کے اعصاب کی تمام تاریں کچھ بائیں طرف کو کھچی ہوئی سی تھیں، جس طرف وہ بیٹھی تھی، اور دونوں کی کرسیوں کے ٹکرانے سے بھی ایک ہلکی سی گدگدی حمید کے بدن میں دوڑ جاتی تھی، وہ مکمل ہوش وحواس میں تھا۔ نہ صرف یہ کہ میٹنگ میں ہونے والی باتوں کا لفظ لفظ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا، وہ دل ہی دل میں ایسے سارے نکات نوٹ کر رہا تھا جہاں وہ اپنے تنقیدی اور دلچسپ تبصروں سے سب شرکا کو چونکا سکتا تھا، اپنی جانب متوجہ کر سکتا تھا، متاثر کر سکتا تھا۔ وہ سامنے کی رو میں بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں کی آنکھوں میں سارے پیغامات پڑھ رہا تھا، ان سے لطف لے رہا تھا، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ پوری طرح اپنے کنٹرول میں تھا۔ اس کا دل اور دماغ اس کے اپنے فیصلوں کے پابند تھے۔ وہ اگر چاہتا تو اس کرسی سے اٹھ کر، اس کمرے سے نکل کر

آ سکتا تھا۔۔رختاج کی زندگی سے نکل کر۔۔واپس اپنی زندگی میں۔خوش باش بھرپور زندگی میں۔جہاں اسکی دنیا تھی۔اسکے دوست احباب، اس کا دفتر، اس کے ساتھی تھے۔جہاں شاعری، موسیقی، خوشی، پریشانی، گناہ، ثواب سب کچھ تھا۔۔۔بس وہ نہیں تھی۔کاش وہ ایسا ہی کرتا۔

یا پھر اس کہانی کے آغاز کے لیے ہمیں اس پتھر کی داستان جاننا پڑے گی جو سینکڑوں یا شاید ہزاروں سال سے ایک حسین پاؤں کے لمس کے انتظار میں ٹھنڈیانی کے کسی پہاڑ کے دامن میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیئے پڑا تھا۔اس پتھر نے اپنے کتنے ساتھیوں کو خاک کا رزق ہوتے، خاک ہوتے دیکھا ہوگا۔اسکے اپنے کتنے اجزاء نامیات بن کر برگ وگل کے رنگ و بو بن چکے ہونگے۔اسکا انتظار اب شاید صبر کی آخری منزل پہ ہوگا کہ اسکی ہر رگ اک دراڑ ہو چکی تھی اور سب مسام پھیل کر اسکے تار و پو کو بکھرنے کی راہ دینے کو تھے، جب حمید کے خوبصورت ساتھی نے اپنا مرمریں پیر اسکے سینے پہ رکھا اور اس سے کہا: ''دیکھئے یہ پتھر کتنا پرانا ہے۔''

بھلا کون کافر اس وقت پتھر کو دیکھتا!

یا شاید اس قصے کی ابتدا اس بادل کے سفر سے ہوتی ہو جو بحرِ ہند سے خالص ترین بخارات چن کر جھومتا جھامتا چلا تھا اور دیودار سے ڈھکے ہوئے ان پہاڑوں میں ایک چاندنی جیسی لڑکی کی جھلک پانے کے لئے سرگرداں تھا۔پھر وہ نظر آ گئی اور وہ بادل بوندوں کے موتی بن کر اس پر واری صدقے ہو گیا۔اس بارش میں، جو کھلی ہوئی دھوپ میں اچانک ہوئی تھی اور اچانک ہی دھوپ کو سٹپٹایا ہوا چھوڑ کر ختم ہو گئی تھی، وہ سب ہی بھیگے تھے۔سر سے پیر تک۔حمید تو اندر باہر سے بھیگ گیا تھا۔بات شاید یہیں کہیں سے شروع ہوئی تھی۔پندرہ منٹ کے اس رم جھم سفر کے دوران جس میں رختاج حمید کے ساتھ تھی۔بس وہ حمید کے ساتھ تھی، باقی سب تو ہیولے تھے، واہمے تھے۔۔پتہ نہیں تھے بھی یا نہیں! وہ راستہ، وہ منظر، ہوا، بارش، وہ بلند پہاڑ، وہ اونچے درخت۔۔سب حاشیہ تھے اس داستان کا جو شروع ہو رہی تھی، آہستہ آہستہ، جیسے کوئی کونپل کھلے، یا جیسے پو پھٹتی ہو، یا شاید جیسے خوشبو پھوٹتی ہو۔اور کہانی کے سب موڑ اپنی جگہ ایک نئے آغاز کی خوبصورتی، اسکا نوکھا پن لئے ہوئے تھے۔وہ جب رختاج نے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے تھے اور پتھروں کے بھاگ جاگ گئے تھے۔فراز کی ''اول اول کی دوستی ہے ابھی'' جو اگر حمید اس وقت رختاج کو نہ سناتا تو اسکی تخلیق کا مقصد ادھورا رہ جاتا۔پہاڑ پر چڑھنے کے مقابلے کی باتیں، مغلوں، ترکوں کی تاریخ کا غلط سلط ذکر۔۔جانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھی۔حمید کو الفاظ سے کوئی مطلب نہیں تھا، وہ تو بس اسکی آواز کے سحر میں گم تھا۔وہ گھنٹیوں کی سی آواز، وہ کھنکتا لہجہ۔حمید تو اسکے لبھا لینے والے ہونٹوں، دلکش ہاتھوں اور خوبصورت پیروں کے افسوں میں کھویا ہوا تھا۔وہ اس مختصر سی رفاقت کے جادو میں گرفتار اور اسکے ختم ہو جانے کے خیال سے خوفزدہ تھا۔

واپسی کا سفر شروع ہوا تو بات کا بیج کہیں بویا جا چکا تھا۔کھوکھے پہ چائے پیتے ہوئے لی جانے والی تصویریں، بس کے اندر بدلی ہوئی بیٹھنے کی ترتیب، رفیع کے گانوں میں کہیں کہیں حسبِ حال فقرے، ساتھیوں کا ہنسی مذاق، ایک دوسرے پہ کسے جانے والے جملے۔سب حمید کو توقع اور خدشے کے درمیان کھینچتے دھکیلتے لئے جا رہے تھے۔'یہ سارا طلسم ختم نہ ہو جائے، اسکی خوبصورتی، دلکشی اور توجہ کا، اور میری

بے تکلفی، برجستگی اور گفتگو کا سحر ٹوٹ نہ جائے'۔اسکے دل کا حال تو حمید نہیں جانتا تھا لیکن وہ دیکھتی ضرور تھی اور کبھی کبھی اسکی نظر سے لگتا تھا کہ جیسے وہ بھی سوچ میں ہے۔

پھر وہ کڑا وقت آ پہنچا۔سب سے مشکل مرحلہ۔ ہوٹل پہنچنے کا مرحلہ جہاں باہر سے آئے ہوئے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے اور جہاں سے وہاں کے، اسی شہر کے رہنے والوں کو باقی شرکاء سے جدا ہونا تھا، اپنے گھروں کو جانا تھا۔رختاج اسی خوبصورت شہر کی رہنے والی تھی۔اسے وہیں کا رہنے والا ہونا بھی چاہیئے تھا۔وہ سویروں کی رنگت اور بہاروں کی تازگی رکھنے والی لڑکی اور ہو بھی کہاں کی سکتی تھی۔سو اسے بھی جانا تھا۔اور صبح باقی سب کو بھی اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا کہ وہ میٹنگ کا آخری دن تھا۔شرکاء کی لسٹ میں سے اسکا فون نمبر اور پتہ لے لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔لیکن حمید کو یہ گوارا نہیں تھا۔دن کا بڑا حصہ جسطرح ان دونوں نے اکٹھے گزارا تھا، جیسے وہ میلوں ساتھ ساتھ چلے تھے اور گھنٹوں انہوں نے آپس میں باتیں کی تھیں اسکے بعد اس سے اسکا فون نمبر مانگ لینا یا ای میل کے پتوں کا تبادلہ بالکل قدرتی بات تھی لیکن حمید ایک بخار کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔وہ سارا دن جس اعتماد اور بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا تھا اب وہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ آخر اپنے اندر دھمالیں ڈالتے ہوئے ہیجان کو اور مختار کی شرارتی نظروں کو جو سارا دن نادیہ کے ساتھ گھومتا رہا تھا اور اب اچانک کہیں سے آ ٹپکا تھا اور مسلسل حمید کے سر پہ سوار تھا، نظر انداز کرتے ہوئے حمید نے اس سے کہہ دیا:

''نمبر دیں گی اپنا؟ میری فون بک میں ابھی تک کسی ترک شہزادی کا نمبر نہیں ہے۔''

جواب میں ایک گھنٹیوں کی سی ہنسی تھی، بے اختیار ہنسی، بے اختیار کر دینے والی ہنسی۔اس کے سوال کا اس سے اچھا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

''شہزادی کہاں کی؟ ہاں میرے آباؤ اجداد ترکی سے آئے تھے، یہی بتایا تھا آپکو۔''

''خیر یقین کیجیے میں اسے ترک شہزادی کے نام سے ہی سیو کرونگا۔''

ایک اور خوبصورت ہنسی کے ساتھ اسنے اپنا نمبر بتا دیا۔

''مجھے ایک رنگ دیجیے، میں آپکا نمبر بھی سیو کرلوں۔''

یہ کہانی شاید یہاں سے آغاز ہوئی۔

حمید اس سے پہلے اضطراب کے اتنے ذائقوں سے ناواقف تھا۔نمبروں کے تبادلے کے بعد سے بے چینی کا ایک اور ہی رنگ تھا۔شام کا وہ بچا کھچا وقت، رات کو سونے سے پہلے تک ایک عجیب کیفیت میں گزرا۔وہ پھر سے لڑکپن کی حدوں کو عبور کرتا ہوا ایک ایسا نوجوان بن گیا تھا جو پہلی محبت کے تجربے سے گزر رہا ہو۔اس کے موبائل فون نے ایک انوکھی اہمیت اختیار کر لی تھی۔وہ کتنی ہی بار یہ دیکھ چکا تھا کہ وہ آن ہے یا نہیں، اسکی بیٹری تو ختم ہونے کے قریب نہیں ہے، کہیں آواز تو بند نہیں ہوگئی اسکی۔اسے معلوم تھا کہ آج وہ رابطہ نہیں کرے گی۔تھکی ہاری گھر پہنچی ہوگی، پھر جیسا کہ اسنے بتایا تھا کہ کھانا بھی وہ خود ہی بناتی ہے۔اور آج شام تک تو یوں بھی وہ ساتھ ہی تھے۔

اسکے باوجود فون کی ہر گھنٹی، ایس ایم ایس کی ہر آواز کے ساتھ حمید کے دل کی دھڑکن کی رفتار کچھ دیر کو ضرور بدل جاتی تھی۔ فون کی آواز سے فون دیکھنے تک کے چند مائیکرو سیکنڈز کے وقفے میں امید و بیم کے کتنے ہی دور گزر جاتے۔ اس نے خود کو فون کرنے یا پیغام بھیجنے سے ایک مسلسل کوشش کے ساتھ روک رکھا تھا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی حمید نے سب سے پہلے موبائیل دیکھا۔ سکرین پر رختاج کا نام جگمگا رہا تھا۔ اسنے صبح بخیر کا پیغام بھیجا تھا۔ بس اسکے بعد سے صبح، خیر ہی خیر ہو گئی تھی۔ نہانا، تیار ہونا، انبساط کا ایک مرحلہ تھا۔ ناشتہ آج بالکل تازہ تھا اور مزیدار۔ اخبار میں ساری خبریں اچھی تھیں۔ اسکا شہر چھوڑتے ہوئے دل پر اداسی کی ایک چھاؤں سی پڑتی تو تھی لیکن شہر فتح کر لینے کا احساس اسکو گہرا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسکے پیغام کے جواب میں حمید نے اسے کال کی:

''شکریہ''

''کس بات کا؟''

''ترک شہزادی نے ہمیں یاد رکھا!''

وہ ہنسی۔

''بھلا آپکو ہم بھول سکتے ہیں؟''

''واقعی؟''

''ہاں نا!''

فون نمبروں کے تبادلے کو ہی اگر اس کہانی کا آغاز قرار دے دیا جائے اور رابطے کے اس انداز کا ذکر تفصیل سے کیا جائے جس سے حمید اور رختاج اگلے چند ماہ میں گزرے تو زبانی گفتگو اور ترسیلی پیغامات سے ایک پوری کتاب ترتیب پا سکتی ہے، ایک ایسی کتاب کہ جو خوبصورت جملوں اور خوشبودار لہجوں سے، ان جملوں اور ان لہجوں سے لپٹی جذبات کی سچائی سے مہکتی ہو اور جو اہلِ دل کیلئے حوالے کا رتبہ رکھتی ہو۔ اس گفتگو کا سب سے انوکھا پہلو یہ تھا کہ حقیقت کبھی ابہام کے لباس سے باہر نہیں آئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے احساسات کے بارے میں اچھی طرح واقف معلوم ہوتے تھے لیکن ان احساسات کا اظہار ہمیشہ ایک اوٹ سے ہوا، ایک پردے میں ہوا۔ دوسروں کے شعروں کے سہارے تھے یا ان کے اپنے برجستہ اور برمحل فقرے، لیکن حقیقت کبھی بھی بالکل بے نقاب نہیں ہوئی۔ اصل میں سچ جتنا خوبصورت تھا، اسکا پردہ بھی اتنا ہی خوبصورت تھا۔۔ شاید زیادہ۔ حمید تو گاہے آپے سے باہر ہوا بھی لیکن رختاج کا ضبط کمال تھا۔ اگر حمید کو کوئی اس ساری کی ساری گفتگو میں سے جو اس تعلق کا تانا بانا بنی، ایک جملہ چننے کے لیے کہے تو اس کا انتخاب ہوگا، ''ہاں نا!''۔ جانے یہ رختاج کی خوبصورت، بہت خوبصورت آواز تھی جس نے ان سادا سے لفظوں میں جادو بھر دیا تھا، یا پھر اس مختصر ترین دو لفظی جملے میں چھپے

ہوئے اقرار اور انکار کا امتزاج تھا جو جذبات کو تموج تو دیتا تھا، سرشاری نہیں ہونے دیتا تھا۔ حمید اکثر اس سے بحث کرتا:

''ایک ہی سانس میں ہاں بھی اور نہ بھی؟''

''تکیہ کلام ہے میرا۔'' وہ کہتی۔

''تکیہ کلام نہیں یہ کمال ہے تمہارا جو کسی ایک طرف تکیہ ہی نہیں کرنے دیتا۔''

جواب میں وہ ہنستی۔ یوں یہ بھی ایک مکمل جواب تھا۔ ایک پہاڑی جھرنے کی سی ہنسی جس میں شک، وہم، گلے، شکوے سب خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے۔

''وہ ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے اور میں۔۔۔''

''جی۔۔؟''

''خیر یہ ہاں ہے یا نہ ہے، مجھے اس ہاں نا سے عشق ہے۔ جو یہ آس ہے تو بندھی رہے، یہ چراغ ہے تو جلا رہے!''

چنانچہ اگلے کئی ماہ اسی آس کی ڈوری میں بندھے ہوئے گزرے۔ اس چراغ کی لو کبھی مدھم ہوئی تو کبھی بھڑک کر جلی۔ اس دوران وہ دونوں کئی بار روٹھے، منے، آگے بڑھے اور کبھی پیچھے بھی ہٹے۔ ایک دن حمید نے فون کیا لیکن رختاج نے کال کاٹ دی۔ پھر اگلے ایک گھنٹے میں کئی بار یہی ہوا۔ حمید کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے خود کو یہ سوچ کر بہلایا کہ اس وقت فون سننا رختاج کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ پھر اس کا میسیج بھی آ گیا:

''ابھی بات نہیں کر سکتی۔ دو بجے کے بعد فون کروں گی۔''

پھر وہ دیر تک پہلے دو بجنے کا اور اس کے بعد اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک۔ اس دن بارا بجے دوپہر سے دن کے دو بجنے تک نجانے کتنے گھنٹے گزرنا تھے۔ شام کے قریب اس نے خود کال کی تو رختاج نے پھر کاٹ دی۔ اب حمید اپنے غصے کو کسی دلیل کی تھپکی نہ دے سکا۔ اگلے دن رختاج کی کال آئی تو اس نے کاٹ دی۔ معذرت کا میسیج آیا تو بھی کوئی جواب نہ دیا۔ یوں پورا دن گزر گیا۔ رختاج کی متعدد کالز اور میسیجز حمید سے کوئی جواب نہ پا سکے۔ لیکن رات ہوتے ہوتے حمید کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے رختاج کو فون کیا۔ رختاج نے اٹھایا تو حمید نے کہا: ''میں تمہیں کبھی فون نہ کرتا اگر جان بچانا فرض نہ ہوتا۔''

''کس کی جان؟'' رختاج نے شوخی سے پوچھا۔

''شاید دونوں کی۔''

یہ تعلق دھیرے دھیرے مضبوط ہوتا رہا۔ اور اس رشتہ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ولولہ جو ایسے کسی بھی تعلق کے آغاز سے وابستہ ہوتا ہے، کبھی دھیما نہیں پڑا۔ اس سارے عرصے میں ایک نہایت خوبصورت اور بھرپور لاسلکی رابطے کے علاوہ وہ کئی بار ملے بھی۔ ایک دفعہ ایک

میٹنگ میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو رختاج حمید کے لئے ایک خوبصورت ڈائری کا تحفہ لائی۔ میٹنگ کے بعد رخصت سے پہلے وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے جب رختاج نے وہ ڈائری حمید کو دی۔ حمید اسے کھول کر دیکھنے لگا تو وہ بولی: ''ابھی باتیں وا تیں کر لیں مجھ سے، یہ میرے بعد دیکھ لیجیئے گا۔''

''میری زندگی کے دو حصے ہیں۔'' حمید نے ڈائری بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک آپ سے پہلے اور ایک آپ کے ساتھ۔ آپ کے بعد کوئی نہیں۔'' اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

زیادہ تر تو ایسی ملاقاتوں کا موقع دفتری میٹنگز اور تقریبات نے ہی فراہم کیا لیکن ایک بار حمید خود بھی اس سے ملنے گیا۔ خاص طور پر صرف اس سے ملنے۔ وہ دن اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔ خیر بھولے گا تو اسے رختاج کے ساتھ گزارا ہوا ایک لمحہ بھی کبھی نہیں۔ لیکن خاص طور پر وہ دن اسلیئے بھی یادگار تھا کہ حمید نے زندگی میں شاید پہلی بار مصلحت اور روزمرہ کی مصروفیت کو بھلا کر دل کی آواز پہ لبیک کہا تھا۔ اس دن اسکا فون کئی دنوں کے بعد آیا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس سے ملنے کی بے تحاشہ خواہش جاگ اٹھی تھی۔ اور پھر جب یہ پتہ چلا کہ وہ اسلام آباد آئی ہوئی ہے، یعنی جہاں اس وقت حمید موجود تھا وہاں سے صرف سوسوا سو کلومیٹر دور، تو ملنے کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا لیکن حمید نے اسے بتایا نہیں۔ وہ دفتر میں تھا جب اسکا فون آیا۔

''آپ کے شہر کے قریب آئی تھی سوچا فون کر لوں''

''کہاں ہیں آپ؟''

''بس آپ سے صرف ۱۱۷ کلومیٹر دور!''

''اسلام آباد۔۔! معلومات تو اچھی ہیں آپ کی''

''آپ کے قریب نہیں رہتے تو کیا ہوا، آپ کی خبر تو مکمل رکھتے ہیں۔''

''زہے نصیب، تو ۱۱۷ کلومیٹر کی زحمت اور کر لیتیں۔''

''تو سب زحمتیں مجھے ہی کرنا ہونگی؟''

''ہوں! ہم سے ملنا آپ کے لئے زحمت ہے؟ اے خوبصورت پیروں والی ترک شہزادی، تو نے آخر دل توڑ دیا نا ہمارا۔''

وہ اپنے دفتر کی کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئی ہوئی تھی اور شاہراہِ دستور کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہری تھی۔

''تو شہزادیوں کا اور کیا کام؟''

''اچھا تو شہزادی صاحبہ، میں تھوڑی دیر میں خود آپ کو فون کرتا ہوں۔''

حمید نے جلدی جلدی اپنے ایسسٹنٹ کو کچھ ہدایات دیں، گھر فون کر کے ماں کو بتایا کہ وہ رات دیر سے آئے گا اور نکل کھڑا ہوا۔

گاڑی سٹارٹ کرتے ہی حمید نے اس سے فون ملا لیا تھا اور پھر وہ سارے راستے باتیں کرتے رہے لیکن حمید نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ اس سے ملنے آرہا ہے۔ اس دن اپنے شہر سے اسلام آباد تک کا سارا راستہ جیسے فلم کا کوئی منظر تھا۔ حمید اسے دیکھ رہا تھا، اس سے گزر رہا تھا لیکن اس میں موجود نہیں تھا۔ اس نے کوئی موڑ غلط نہیں کاٹا، کوئی اشارہ نہیں توڑا، وہ کہیں راہ نہیں بھولا اور نہ ہی کسی حادثے کا شکار ہوا لیکن اسے راستے کی کوئی تفصیل یاد نہیں۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے رختاج کے لئے پھول کہاں سے خریدے اور کس طرح خریدے کہ اسے، جو فون پہ مسلسل حمید کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی، پتہ بھی نہ چلے۔ اس نے رختاج کے دروازے پہ دستک دی تو حمید کو اس کی ''کون'' فون پر بھی سنائی دی اور بغیر فون کے بھی۔ بس یہاں سے آگے کی سب باتیں اسے ایک ایک تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ تقریباً سب! رختاج کی حیرت، اس کی خوشی، دامن کوہ پہ اوپن ایئر ریسٹورانٹ میں ڈنر، جسم کو گدگداتی ہوئی ہلکی سی سردی، آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی سرسبز وادی، اس میں سے گزرتی ہوئی سڑک، دور شہر کی روشنیاں، ریسٹورانٹ کے گویے کی بھرپور، بلند اور خوبصورت آواز جو لگتا تھا کہ ان پہاڑوں اور وادیوں کی اپنی آواز ہے۔

یا پھر یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب دامن کوہ کے اس خوبصورت ریستوران میں ڈنر کے بعد رختاج نے اسے بتایا کہ اس سے ملاقات سے ایک ہفتہ قبل اسکی منگنی ہو چکی تھی۔ نہیں بلکہ یہ کہانی کا ایک خوفناک موڑ تھا۔ حمید کا واپسی کا سفر بھی راستے سے مکمل بے خبری میں کٹا۔ لیکن اس بار کیفیت بالکل مختلف تھی۔ آتے ہوئے سرشاری تھی تو لوٹتے ہوئے سناٹا۔ ایک بار پھر اسے یاد نہیں تھا کہ ڈنر کے بعد انہوں نے کچھ لیا یا نہیں، اس نے بل کیسے ادا کیا، بل تھا کتنا، اور نہ ہی یہ کہ بل اسی نے ادا کیا یا رختاج نے؟ اسے اگر کچھ یاد تھا تو بس رختاج کی وہ باتیں جو اس نے اپنے منگیتر کے بارے میں کی تھیں۔

سہیل اس کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس نے کچھ ہی عرصہ پہلے ایک دن بڑے سیدھے سادے سے انداز میں رختاج سے کہا تھا کہ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ رختاج کو اس کا یہ صاف ستھرا اور شریفانہ طریقہ پسند آیا تھا۔ اس کے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ چنانچہ بچوں کے حقوق پہ کام کرنے والی این جی اوز کی اس سالانہ کانفرنس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے، جس میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی، رختاج کی منگنی ہو گئی تھی۔

اس رات حمید کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اتنی جلدی وہ کیسے جا سکتی ہے، اس کی دنیا سے، اسے چھیڑ کر، اسے چھوڑ کر۔ ابھی تو حمید نے اسے اپنی خیال کی وادیوں کی سیر بھی نہیں کروائی تھی۔ اپنی جنت، اپنے جہنم نہیں دکھائے تھے۔ ابھی تو انکا ملنا باقی تھا، پھر بچھڑنا کیسا! ابھی تو خواب دیکھنا تھے، تعبیریں ڈھونڈنا تھیں۔ خوف اور امیدیں بانٹنا تھیں۔ اس کا ذہن بس ایک ہی سوال دہراتا رہا۔ بلکہ ایک ہی لفظ۔۔ ''کیوں؟''۔ وہ اگر سہیل کو پسند کرتی تھی تو اس کے ساتھ اس قدر دوستی بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سب حمید کی حماقت ہی سہی لیکن اس نے حمید کی حوصلہ افزائی ہی کیوں کی؟ پھر اسے رختاج کا کہا ہوا ایک ایک جملہ ایک ایک لفظ یاد آتا رہا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی بات

نہیں کی تھی کہ جس سے حمید کے لئے اس کے دلی جذبات کا کھل کے اظہار ہو جاتا۔لیکن اس نے کبھی کچھ ایسا بھی نہیں کہا تھا کہ جس سے حمید کو یہ اندازہ ہوتا کہ ان کا تعلق بس ایک خوبصورت دوستی تھی اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔اس نے کبھی حمید کے کسی ذو معنی جملے کا کوئی حوصلہ شکن جواب نہیں دیا تھا۔لیکن آج کی اس خبر سے زیادہ حوصلہ شکن بات آخر کیا ہوگی۔حمید کو احساس ہوا کہ اسے اس گھنٹیوں جیسی آواز سے جو اس رات دیر تک اس کے ذہن میں گونجتی رہی، چڑ ہونے لگی تھی۔ پھر اس نے ایک مشکل فیصلہ کیا۔اس نے اپنے موبائیل میں سے سم نکال کر سائیڈ ٹیبل کے ایک دراز میں ڈالی اور خود کو ایک غیر آرام دہ نیند کے حوالے کر دیا۔اب الجھن مختلف تھی۔سم کو دوبارا فون میں ڈال کر اس کی ممکنہ کال کے انتظار کی خواہش نے ساری رات نیند کو گہرا نہیں ہونے دیا۔

اس خواہش نے حمید کو اگلے کئی سال بے چین رکھا۔وہ جانتا تھا کہ ابھی یہ زخم ہرا ہے، چوٹ تازہ ہے۔ابھی تکلیف برداشت سے باہر ہے، ابھی تو اس کے بدن کے سب مسام جلتے ہیں۔سانس کی ہر لہر اس کے سینے میں چبھی پھانس کو چھیڑ کر گزرتی ہے۔ابھی تو اس کی ہر دھڑکن دل کی دشمن ہے۔حادثہ بالکل نیا ہے۔سانحہ ابھی گزرا نہیں، گزر رہا ہے۔جب کچھ وقت بیت جائے گا تو شاید وہ کبھی اس قابل ہو سکے کہ اس واقعے پر، اس سے منسلک ہر یاد پر مسکرائے۔اس ساری بات ہی کو اپنی حماقت یا جذباتیت سے تعبیر کر سکے۔شاید کبھی ایسا وقت آئے۔لیکن اس سے پہلے اور بھی کئی مرحلے آئیں گے۔ پہلے پہل رختاج کی یاد اس سے متعلق ہر بات کو حمید کے شعور کے راستے سے چن کر گٹھڑی میں باندھے گی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ رہے گی لیکن خیال کی ہر رو کو آتے جاتے چھیڑے گی۔ ہر شعر، ہر گیت میں، کتاب کا ہر ورق پلٹتے ہوئے، کسی کے ہاتھ، کسی کے پاؤں دیکھ کر، کسی کے ناک نقشے کی شباہت میں، کسی کی آواز، کسی کی چال کے انداز میں چھپ کر سانسوں پر پھندے ڈالے گی۔ پھر اور وقت گزرے گا تو صرف کوئی ہم نام، کوئی ہم شکل، کوئی سی بھی اتفاقیہ گہری مماثلت کچوکے لگائے گی۔ پھر بس وہی ہوگا جو ہوتا ہے۔وقت کی گرد ہر طرح کے چمکتے دمکتے، کانپتے لرزتے، ڈوبتے، ڈبڈباتے، ڈولتے، لڑکھڑاتے لمحوں کو اپنی گود میں بھینچ لے گی، کبھی کبھی صرف ایک جھلک دکھا دینے کے لئے۔

بارہا ایسے موقعے آئے جب اس سے بات کرنے کی، اسے دیکھنے کی، اس سے ملنے کی تمنا حمید کے رگ وپے میں انگڑائی کی طرح تڑپنے لگتی۔اسے رختاج کا فون نمبر زبانی یاد تھا۔اس کے دفتر میں بھی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔سم کو ایکٹیویٹ کروانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ذرا سی کوشش سے مشترکہ رابطوں کو استعمال میں لا کر کم از کم اس کی خیر خبر تو معلوم کی ہی جا سکتی تھی۔اور اس اختیار کو استعمال کرنے کی طلب پہ قابو پانا کچھ آسان نہ تھا۔لیکن حمید نے تو ایسے مواقع سے بھی گریز کرنا شروع کر دیا تھا جہاں رختاج سے ملاقات کا کوئی امکان نکلتا ہو۔پھر وقت نے اپنا کام کیا اور اسکی یاد، اس سے ملنے کی، بات کرنے کی بے تحاشا خواہش آہستہ آہستہ حمید کی نس نس سے پسپا ہوتی ہوئی دل کے ایک گوشے میں سمٹ گئی۔وہ نارمل ہو گیا۔اگر اس کو نارمل کہا جا سکے کہ وہ سوتا، کھاتا پیتا تھا، دفتر میں بھی ٹھیک کام کرتا تھا۔لیکن اب زندگی کی یہ سب مصروفیات میکینیکل ہو گئی تھیں۔اب لنچ کے وقت دفتر میں نوک جھونک کی قہقہہ بار محفل نہیں جمتی تھی۔اور اگر جمتی بھی تھی تو حمید اس

میں شامل نہیں ہوتا تھا۔اس کی شوخی اور ظرافت نے سنجیدگی کے لئے جگہ خالی کر دی تھی۔ دوستوں کے ساتھ تفریح اب اسے بور کرتی تھی۔ تنہائی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھی لیکن لوگوں کو اس سے جس خوش مزاجی کی توقع تھی وہ اب اسکے بس سے باہر تھی۔

پھر اسے ایک بڑے شہر میں نوکری مل گئی۔ وہ کرایے کا گھر خالی کر کے، اپنی ماں کے ساتھ نئے شہر میں منتقل ہو گیا۔ رختاج سے رابطے کا امکان کچھ اور کم ہو گیا۔فون نمبر تو پہلے ہی بدل چکا تھا، اب وہ اس ادارے میں بھی نہیں رہا جس میں رختاج کے ساتھ تعلق کے دنوں میں کام کرتا تھا، اور نہ ہی وہ شہر تھا جس میں وہ ان دنوں رہتا تھا۔ یوں تو وہ کوشش کر کے اب بھی حمید کا پتا نشان ڈھونڈ سکتی تھی لیکن اس نے تو اس تبدیلی سے پہلے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ حمید کو شاید اس کی طرف سے ایسی کسی کوشش کا انتظار تھا جو شہر بدلنے کے بعد بھی ختم تو نہیں ہوا لیکن بڑے شہر کی گہما گہمی، نئے ماحول کے تقاضوں اور سب سے بڑھ کر ملازمت کی مصروفیات میں دب کر بڑی حد تک اپنی کسک کھو بیٹھا۔اسکی ماں کی خواہش تھی کہ وہ شادی کر لے لیکن وہ ہمیشہ اس موضوع کو ٹال جاتا تھا۔ اسے یوں شادی پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا اور نہ ہی وہ روائتی عاشقوں کی طرح تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔بس اسے شادی کے ذکر سے ہی ہول آتا تھا۔

اسکی ملازمت کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اسے اکثر شہر سے باہر کا سفر کرنا پڑتا تھا۔نئی جگہیں دیکھنا اور مختلف لوگوں سے ملنا حمید کے کام کا حصہ تھا۔ وہ تقریباً نارمل ہو چلا تھا جب قسمت اسے ایک بار پھر رختاج کے شہر لے گئی۔ یہ ایک مختصر دورہ تھا۔حمید کے ادارے نے اس شہر کی ایسی تمام تنظیموں کے ساتھ ایک میٹنگ کا اہتمام کیا تھا جو بچوں کی صحت کے حوالے سے لوگوں میں شعور پیدا کرنے اور آگہی پھیلانے کا کام کر رہی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ اپنے اپنے تجربات ایکدوسرے کو بتائے جائیں اور تعاون کے مواقع ڈھونڈے جائیں۔جس ادارے میں رختاج کام کرتی تھی وہ بھی مدعو تھا۔حمید کا دل سارا وقت اسکی کنپٹیوں میں دھڑکتا رہا۔اسکی آنکھیں، اسکے کان، اسکے ہاتھ۔۔کچھ بھی اسکے قابو میں نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میٹنگ کے سارے شرکاء آ گئے اور رختاج کے ادارے سے بھی ایک صاحب پہنچ گئے، یعنی اس کے آنے کا امکان ختم ہو گیا لیکن حمید کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتی رہیں۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے بھی اپنی پوری توجہ میٹنگ پہ مرکوز نہیں کر سکا۔سیشن ختم ہوتے ہوتے وہ جان چکا تھا کہ اپنے فیصلے کے خلاف شہر سے واپسی پہ وہ اس کے دفتر کا چکر ضرور لگائے گا۔لیکن میٹنگ کے اختتام پہ چائے کے دوران رختاج کے دفتر سے آنے والے صاحب سے معلوم ہوا کہ رختاج تو ملازمت چھوڑ چکی ہے۔حمید اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس کے متعلق جاننے سے بھی گریز کر رہا تھا۔لیکن چائے پہ اسکے قدم خود ہی اسے سرفراز کے پاس لے گئے۔ اپنے اداروں اور انکے کام سے متعلق کچھ غیر رسمی باتیں کرتے کرتے اس نے خود کو کہتے سنا: ''کچھ سال قبل مجھے یاد پڑتا ہے ایسی ایک میٹنگ میں ایک خاتون آئی تھیں آپ کے ادارے سے۔ میں اس وقت ایک ڈونر ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ بڑا unusual سا نام تھا ان کا۔ رختاج!''

''جی ہاں، رختاج تو دو سال ہوئے ملازمت چھوڑ گئیں۔'' سرفراز نے بتایا۔ پھر وہ اس ڈونر ایجنسی کی اور اپنے ادارے کی شراکت کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اور حمید رختاج کے نام کو دوبارا زبان پہ آنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اس کوشش میں

کامیاب رہا۔اس شام واپسی پہ رختاج کے شہر سے نکلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی اسکی زندگی سے نکل گئی ہے۔

پھر کچھ سال اور بیت گئے۔وہ رختاج کے سحر سے کچھ اور آزاد ہو گیا۔اس طلسم کے ٹوٹنے میں کچھ دخل فائزہ کا بھی تھا۔فائزہ کہیں اور سے ٹرانسفر ہو کر ان کے دفتر میں آئی تھی۔وہ اتنی نٹ کھٹ، بے تکلف اور بے دھڑک تھی کہ اس سے دوستی نہ ہونا مشکل تھا۔لیکن اس دوستی میں رومان کا گزر نہیں تھا۔اصل میں اس کی سارے ہی دفتر سے دوستی تھی۔وہ ایک طرح سے تمام سٹاف کی لاڈلی تھی۔بلکہ حمید تو شروع میں اس سے بہت کھچا کھچا رہا۔پھر ایک دن فائزہ کی کسی پریزنٹیشن پہ حمید نے تنقید کر ڈالی۔تنقید اتنی سخت تھی کہ وہ جو صرف تعریف وستائش ہی کی عادی تھی، رو پڑی۔حمید کے لئے یہ بالکل غیر متوقع بات تھی۔وہ گھبرا گیا۔پھر اس نے فائزہ سے معذرت کی اور یہیں سے انکی دوستی کا آغاز ہوا۔یہ دوستی جلد ہی خوب گہری ہوگئی اور اس نے حمید کے مزاج پہ برسوں سے جمی ہوئی اداسی کی دھول جھاڑ دی۔دفتر میں جو کبھی کبھی کام کے بعد محفل سجتی تھی، وہ بھی اب اس میں شامل ہونے لگا۔تفریحی سفر اور پکنک جو وہ بالکل چھوڑ چکا تھا، دوبارا سے اسکی زندگی میں لوٹ آئے۔حمید اب پہلے جیسا شوخ وشنگ تو نہیں رہا تھا لیکن وہ تنہائی پسندی اور سنجیدگی کا حصار جو اتنے سالوں سے اسکے گرد قائم ہو گیا تھا، ٹوٹ گیا۔فائزہ اپنے چھوٹے بڑے تمام معاملات کے بارے میں اس سے ضرور بات کرتی تھی۔اس کے چھوٹے بھائی کی شرارتیں ہوں، والد کی بیماری، کسی سہیلی سے لڑائی جھگڑا ہو، یا کوئی بھی پریشانی یا خوشی۔وہ اس کا تذکرہ حمید سے ضرور کرتی تھی۔شروع میں تو وہ صرف اس کا دل رکھنے کے لئے دلچسپی ظاہر کرتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ جیسے فائزہ کی زندگی کے معاملات خود اسی کی زندگی کا حصہ بنتے گئے۔وہ اتنی بے ساختگی اور سادگی سے اپنے روزمرہ کے واقعات اسے سناتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں بہت دلچسپ اور اہم ہو جاتی تھیں۔یوں بھی اس کے لئے سب چیزیں ایک جیسی اہم تھیں۔وہ اپنی مرغی کی گھر سے باہر جا کر انڈہ دینے کی عادت کا ذکر بھی اسی سنجیدگی سے کرتی تھی جتنی کہ مثال کے طور پہ اپنے ایک نکھٹو کزن سے اپنی ممکنہ منگنی کے خدشے کا۔یا پھر سب چیزیں اس کے لئے ایک جیسی غیر اہم تھیں۔ایک خاص حد کے بعد اسے کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔لیکن وہ حمید کا بہت خیال رکھتی تھی۔اکثر اسکے لئے کچھ نہ کچھ بنا کے لے آتی تھی۔دفتر کے ایسے کئی کاموں میں جہاں کمپیوٹر کا عمل دخل حمید کی مہارت کے مقابلے میں زیادہ ہوتا وہ اسکی بہت مدد کر دیتی۔لمبی لمبی رپورٹس ٹائپ کرنے میں، ایکسل شیٹس بنانے، ان میں اعداد وشمار ڈالنے، انکا تجزیہ کرنے میں اور انٹرنیٹ سے مطلوبہ مواد ڈھونڈ نکالنے کے سلسلے میں کتنی ہی بار اس نے حمید کا ہاتھ بٹایا۔دفتر میں اس غیر معمولی التفات پر اشارے کنایے شروع ہو گئے تھے۔کبھی کبھی کوئی فقرہ بھی چست کر دیا جاتا تھا۔لیکن نہ حمید کو اس بات کی پروا تھی اور نہ فائزہ کو۔بلکہ اکثر ان کی کوشش ہوتی تھی کہ فیلڈ وزٹ پر اکٹھے جائیں۔

اس دن بھی وہ ایک دور دراز کے گاؤں کے معائنے پہ گئے تھے۔انہیں وہاں اپنے ادارے کے ان کاموں کا جائزہ لینا تھا جو پچھلے سال ماحولیاتی تحفظ کے لئے کئے گئے تھے۔چالیس کلومیٹر کا سفر طے کر کے ائرکنڈیشنڈ گاڑی سے اترے تو گرم ہوا کے جھونکوں نے تلخ حقیقتوں کی طرح انکا استقبال کیا۔یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی سخت پتھریلی چٹانوں اور انتہائی دشوار گزار راستوں میں کہیں کہیں قابل

کاشت رقبوں کی ٹکڑیاں تھیں جہاں دو دو چار چار خاندان آباد تھے۔انکے ادارے نے کبھی انکے لئے کچھ نلکے لگوائے تھے اور سستی لیٹرینیں بنوا کے دی تھیں۔آج کی وزٹ انہی کے استعمال اور افادیت کا جائزہ لینے کے لئے تھی۔

''پتا نہیں لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں۔'' حمید نے کہا۔'' پانی نہیں، بجلی نہیں۔ یہاں تک کہ یہاں تو زمین بھی ایسی زرخیز نہیں ہے۔''

''نہ کوئی سکول نہ ڈسپنسری۔'' فائزہ نے کہا۔'' آپ کو پتا ہے بچوں کو سکول جانے کے لئے روزانہ دو گھنٹے پیدل چلنا پڑتا ہے۔''

''اور ایسے بیشمار گاؤں ہیں ہمارے ملک میں۔'' حمید نے کہا۔'' کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے ادارے جیسے سماجی خدمت کے ادارے اس طرح کے دیہاتوں میں حکومت کے ساتھ مل کر تعلیم اور صحت کے لئے وسائل مہیا کریں۔''

''بہت سے ادارے یہ کام کر رہے ہیں۔''

''ہاں کر تو رہے ہیں لیکن حقیقی کام سے زیادہ آگاہی پھیلانے کے نام پہ تنظیم سازی، اشتہار بازی، سیمینار وغیرہ پر زور دیا جاتا ہے۔یا پھر یہی نلکے ہیں اور لیٹرینیں، جن پہ پیسہ لگ جاتا ہے لیکن لوگ انہیں استعمال نہیں کرتے۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔کئی لوگ اپنے طور پر بڑی خدمت کر رہے ہیں۔''

''ہاں بہتیرے اللہ کے بندے ہیں۔'' حمید نے کہا۔

''میری ایک سہیلی ہے رختاج، وہ اپنی نوکری، گھر بار سب چھوڑ کر ایسے ہی ایک دور دراز کے گاؤں میں چلی گئی ہے۔ وہاں وہ بچوں کو پڑھا رہی ہے جن کے لئے کوئی سکول نہیں ہے۔گاؤں والوں نے اسے ایک گھر دیا ہوا ہے اور اس کی زندگی کی ساری ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔''

''رختاج تمہاری سہیلی ہے؟'' حمید نے بے ساختہ پوچھا۔

''کیوں؟ آپ جانتے ہیں انہیں؟''

''ہاں۔۔نہیں۔۔۔! میرا مطلب ہے کہ جانتا تھا۔''

حمید کے لہجے میں ضرور کچھ ایسا تھا کہ فائزہ انکے تعلق کی نوعیت کے بارے میں سب جان گئی۔

''ہوں۔۔تو آپ ہیں وہ شخصیت جن کی خاطر انہوں نے اپنی منگنی توڑ دی تھی۔اور آپ نے پلٹ کر کبھی انکی خبر تک نہ لی۔''

''منگنی توڑ دی؟ کیا مطلب؟''

''تو آپ کو کچھ پتا نہیں؟''

''یقین کرو۔۔میں۔۔۔'' حمید کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے تو اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بس ایک دن اچانک ہی اس نے سہیل کو منع کر دیا۔ معذرت وعذرت کی اس سے، لیکن کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اس شریف آدمی نے بہت پوچھا لیکن رختاج نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ سوائے میرے۔'' فائزہ کی زبان حسب معمول تیزی سے چل رہی تھی اور حمید کے لئے چلتے رہنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

''میرے ساتھ تو ان کی اس وقت سے دوستی تھی جب میں انٹرن شپ کرنے اس ادارے میں آئی تھی جہاں وہ کام کرتی تھیں۔ وہ اتنی سینیئر ہونے کے باوجود میرا اس قدر خیال رکھتی تھیں۔ ہم بیسٹ فرینڈز تھیں لیکن انہوں نے مجھے بھی کبھی آپ کا نام نہیں بتایا۔ بس میں یہ جانتی تھی کہ کوئی ان کی زندگی میں آ گیا ہے اور بڑے غلط وقت میں آ گیا ہے۔ پھر انہوں نے نوکری بھی چھوڑ دی۔ اس سارے عرصے میں انہیں بہت انتظار رہا آپ کے فون کا۔''

''تو وہ خود کال کر لیتی۔ مجھے بتاتی تو سہی۔۔۔'' حمید کو یاد آیا کہ اس نے اسی رات اپنی سم نکال دی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ رختاج منگنی شدہ ہے، تو اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''انہوں نے بہت کوشش کی تھی لیکن آپ کا نمبر مسلسل بند تھا۔''

''رابطہ تو وہ پھر بھی کر سکتی تھی۔'' حمید کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''اور آپ نے کیوں منقطع کر دیا تھا رابطہ؟''

''میں تو۔۔۔'' اس نے کچھ کہنے سے پہلے الفاظ کو دوبارا ترتیب دیا۔ ''میں نے سمجھا کہ یہی سب سے بہتر فیصلہ ہے۔ سہیل اچھا بندہ تھا۔ وہ اسے پسند بھی کرتی تھی۔''

''سہیل واقعی بہت اچھا آدمی تھا۔ لیکن آپ کو پتا ہے وہ آپ سے محبت کرتی تھیں۔ سہیل سے منگنی آپ سے ملنے سے پہلے کی بات ہے۔ اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ سہیل ان کا انتخاب تھا۔ آپ سے ملاقات کے بعد وہ مسلسل اس کشمکش میں رہیں کہ منگنی برقرار رکھنا ایک طرح کی بددیانتی ہے۔ سہیل کے ساتھ بھی اور شاید آپ کے ساتھ بھی۔''

''لیکن وہ مجھے بتاتی تو۔!''

''رختاج بڑی خوددار لڑکی ہے۔ ویسے بھی آپ تو انہیں شہزادی کہتے تھے نا! انہوں نے مجھے بتایا تھا۔ آپ نے اپنا فون بند کر دیا، ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ آخر کیوں پوچھتیں؟''

''اب کہاں ہے وہ؟''

''مجھے exactly تو نہیں پتا۔ میرا بھی ان سے دو سال سے رابطہ نہیں ہوا۔ لیکن دو سال پہلے وہ کاہنہ میں تھیں۔ مانسہرہ سے ۳۰ کلومیٹر دور ایک گاؤں ہے۔''

حمید مانسہرہ جانے والی گاڑی میں سوار ہے۔ وہ سارا دن کی لمبی فیلڈ وزٹ کی تھکن سے چور ہے، بھوکا بھی ہے کہ کھانے کا وقت نہیں نکال پایا۔ اسے یہ بھی نہیں پتا کہ مانسہرہ سے آگے کا ہنہ گاؤں جانے کے لئے اسے کوئی گاڑی دستیاب ہوگی بھی یا نہیں، اور اگر ہوگی بھی تو کب؟ 'کیا' اور 'کیسے' کے عنوانات سے اسکے ذہن میں اور بھی کئی سوال ہیں لیکن سب ایک سرخوشی میں دب گئے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کا جواب بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف یہ سوچ رہا ہے کہ کہانی شاید ابھی تک شروع ہی نہیں ہوئی۔ کہانی تو اب شروع ہوگی۔

 

مائی بیٹری

وہ دیکھنے میں اچھی خاصی تھی۔ بلکہ اگر اتنی میلی کچیلی نہ ہوتی تو کہیں سے بھی پاگل نہ لگتی۔ کہتے ہیں 2005 کے زلزلے میں اس کا سارا خاندان دب کے مر گیا تھا۔ اسے زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا لیکن مانسہرہ کا ڈی ایچ کیو ہسپتال پہلے ہی مریضوں سے اٹا پڑا تھا۔ مریضوں کو قریبی شہروں کے ہسپتالوں میں بھیجا جا رہا تھا۔ اسے بھی ایک چھوٹے سے شہر کے نسبتاً کم گنجان سرکاری ہسپتال میں شفٹ کر دیا گیا۔ زخم ٹھیک ہوئے تو ہسپتال والوں نے ڈسچارج کر دیا اور وہ اپنی واحد پونجی، ایک موبائل فون جو زلزلے کے وقت بھی اس کے پاس تھا، لئے سڑک پہ آ گئی۔

گھر بار تباہ ہو چکا تھا، کوئی اور ٹھور ٹھکانا تھا نہیں، نہ ہی دماغی توازن برقرار رہا تھا۔ نجانے چوٹ کا اثر تھا یا ذہنی صدمے کا، وہ بالکل گم سم ہو گئی تھی۔ پھر کسی عزیز رشتے دار نے بھی پتا نہ لیا، معلوم نہیں کوئی بچا بھی تھا کہ نہیں۔ سو وہ ہسپتال سے جو نکلی تو سیدھی چلتی چلتی، راستے کے دو چوک پار کر کے، میونسپل سٹیڈیم اور بس سٹینڈ سے ہوتی ہوئی محلّہ چاہ چشتیاں آ پہنچی۔ یہاں تک آتے آتے تھک گئی ہو گی، یہیں رک گئی۔ اور پھر یہیں کی ہو کے رہ گئی۔

یہ تو تھی ایک کہانی جو ہم نے قدرے تفصیلاً بیان کر دی ورنہ اس کی اصل کے بارے میں، اس کے پاگل پن اور اس کے موبائل فون سے متعلق اور بھی کئی قصے مشہور تھے۔ ایک کے مطابق وہ انڈین جاسوس تھی جو اس چھوٹے سے شہر کے قریب بننے والے دفاعی نوعیت کے ہنگامی ہوائی اڈے کی نگرانی کے لئے آئی تھی اور اپنے اس موبائل فون پر جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی، اہم معلومات اپنے ملک کو بھیجتی رہتی تھی۔ پھر ایک خاصا مقبول قصہ یہ تھا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگنے کو نکلی تھی۔ وہ شخص مقررہ جگہ پہ پہنچا نہیں، اور اب یہ اس کے فون یا پیغام کے انتظار میں ہر وقت اپنے موبائل کو دیکھتی رہتی ہے۔ کچھ کہتے تھے سب ڈھونگ ہے۔ پاگل پن کی آڑ میں لوگوں کے گھروں اور معمولات کا جائزہ لیتی رہتی ہے، اور پھر اپنے گروہ کو فون کر کے وارداتیں کروا دیتی ہے۔ چنانچہ مزے کی بات یہ تھی کہ سچ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں جس سے بھی پوچھ لو وہ پورے اعتماد اور تیقن کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سنا دے گا۔ ہاں محلے کے بچے، خاص طور پہ وہ جو حالیہ سالوں میں کہیں اور سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے، ہو سکتا ہے کہ نہ جانتے ہوں کہ وہ جو سارا دن اسے مائی بیٹری کے نام سے چھیڑتے رہتے تھے، تو اس چھیڑ کی وجہ تسمیہ کیا تھی۔ یوں اس سے متعلق کہانیوں کی طرح، اس کی چھیڑ کے بھی کئی نام تھے۔ چارجر، موبائل، اور یہاں تک کہ نوکیا۔ لیکن مائی بیٹری کو تو اب اس کے نام کی حیثیت حاصل تھی۔ یوں بھی اس کا اصل نام کوئی جانتا ہی نہیں

تھا۔ان سب کہانیوں اور ناموں کی تخلیق کے پیچھے اس کا اپنے موبائیل فون کے ساتھ تعلق کارفرما تھا۔جیسے وہ اپنے موبائیل فون کو جان سے لگا کے رکھتی تھی ،لگتا تھا اسے دنیا میں اس کے علاوہ اور کسی کی پروا نہیں ہے۔ویسے تو پروا کے لئے تھا بھی کوئی نہیں لیکن اسے تو بھوک پیاس، گرمی سردی کسی بھی چیز کا خیال نہیں تھا۔کسی نے کچھ دے دیا تو کھالیا،کسی نے پانی پلا دیا تو پی لیا ورنہ گلی کی ٹونٹی کے گرم پانی سے پیاس بجھا لی۔بی بی وکیلنی یا باؤ جی کی بیوی کبھی کبھی کپڑے نہ بدلوا دیتیں تو اس کے تن پر تو چیتھڑے جھول رہے ہوتے۔اس کے بال جو یقیناً کبھی گھنگھریالے، ریشمیں اور لچھے دار رہے ہونگے ،اب آپس میں بری طرح الجھے ہوئے ،بے جان اور خشک تھے۔ناخن بڑھ بڑھ کر ٹوٹ جاتے تھے،اور میل کی تو پورے بدن پہ جیسے ایک تہہ تھی۔بی بی وکیلنی یا ان جیسی کسی خداترس خاتون نے ایک آدھ دفعہ کوشش کی تھی کہ اسے نہلا دیں لیکن اس کام کے لئے خداترسی کے علاوہ جس حوصلے کی ضرورت تھی وہ صرف رفیق ہیجڑے کو میسر تھا۔ریڈ انڈین نظر آنے والا یہ گندمی رنگت اور مضبوط بدن کا ہیجڑا کبھی کبھی اسے کپڑوں سمیت اپنی حویلی کے صحن میں نلکے کے نیچے بٹھا کر نہلا دیتا تھا۔وہ اس کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھتا تھا۔کم ازکم رات کو ایک بار ضرور دیکھ لیتا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ہے یا نہیں۔اس کا ٹھکانہ بھی اصل میں گلی کے سرے پہ باؤ جی کی دکان کے سامنے ہیجڑوں کی حویلی کی ڈیوڑھی میں ہی تھا۔یہ بھی شاید رفیق ہی کی مہربانی تھی یا پھر وہ خود ہی وہاں پڑ رہی تھی۔پڑ رہنا بھی کیا،سارا دن تو محلے کی گلیوں کے چکر کاٹتی رہتی اور رات کو وہاں آجاتی۔اسی آنگن کے ایک کونے میں بنی ہوئی لیٹرین بھی اس کے استعمال میں تھی۔

اسے اگر خیال تھا تو بس اپنے فون کا تھا جسے وہ نائلون کے کئی لفافوں میں لپیٹ کر رکھتی تھی۔جی ہاں،ایک کے بعد ایک لفافہ۔سب سے پہلے تو کسی ڈبل روٹی یا بن وغیرہ کے غلاف (Wrapper) میں لپیٹتی، پھر اس کے اوپر نائلون کے شاپنگ بیگز چڑھاتی جو وہ سارا دن گلیاں بازاروں سے اکٹھے کرتی رہتی تھی۔اس چھوٹے سے بنڈل کو وہ ایک ڈوری کے ذریعے سے اپنی کمر، بازو یا گلے میں باندھ کر رکھتی۔جہاں کہیں ستانے کے لئے بیٹھتی ،کسی مکان کی سیڑھیوں پر، کسی کے برآمدے میں یا کسی درخت کے نیچے،نہایت احتیاط اور توجہ کے ساتھ وہ ایک کے بعد ایک لفافہ کھولتی ،موبائل فون کو نکال کر گود میں رکھتی اور محویت سے اس کی اندھی سکرین کو دیکھتی رہتی۔کبھی کبھی اس کا کوئی بٹن بھی دباتی ،کبھی تو موبائل فون کی پشت کو کھول کر اس کی بیٹری نکال لیتی ،اسے اپنے میلے کچیلے پلو سے صاف کرتی اور دوبارا بند کر کے سکرین پہ نگاہیں جما دیتی۔

اس کو چھیڑنا ،اس پر آوازیں کسنا کچھ عرصے تک محلے کے بچوں کا من پسند مشغلہ رہا تھا۔جہاں سے بھی گزرتی نوجوان لڑکے اور بعض اوقات تو بڑی عمر کے لوگ بھی کوئی نہ کوئی شرارتی جملہ اچھال دیتے تھے۔شروع میں تو اس کے پیچھے لونڈھار کی لونڈھار لگی رہتی تھی۔لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ محلے کے معاشرتی ڈھانچے کا حصہ بن گئی۔اس کا پیچھا کرنے کا تجسس ختم ہو گیا۔اب یہی تھا کہ بچوں یا نوجوانوں کے کسی اکٹھ کے پاس سے گزرتی تو 'مائی بیٹری' یا 'چارجر' کا نعرہ لگ جاتا، یا کوئی پوچھ لیتا ''مائی فون بیچے گی؟'' اور وہ کچھ بڑبڑانا

شروع کر دیتی۔ یہ کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہتی ہے۔لیکن اتنا ضرور ظاہر ہو جاتا تھا کہ اسے غصہ آیا ہے۔ ورنہ اس کی واحد گفتگو موبائل چارج کرنے کی درخواست تھی اور بس۔''موبائل چارج کر دو گے؟'' اس ایک جملے کے علاوہ نہ اس نے کبھی کوئی اور بات کی اور نہ کسی کے کسی سوال یا مذاق کا کچھ جواب دیا۔ ہاں موبائل چارج کرنے کی یہ گزارش وہ روزانہ ہر دکاندار، ہر ریڑھی بان اور ہر اس عورت سے کرتی جو اپنے گھر کے دروازے پہ کھڑی اسے نظر آجاتی۔ یہ بات وہ اتنی لجاجت سے کہتی کہ باؤ جی نے تو ایک دفعہ جواباً کہا بھی ''لا موبائل دے، میں چارج کر دوں۔'' لیکن اس پر اس نے شاپنگ بیگز کے اس پیکٹ کو، جس میں اس کا موبائیل فون بند تھا اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں فوراً اشک اتر آیا۔

باؤ جی کی دکان کے تھڑے پہ جن لڑکوں کا ٹولا تقریباً ہر وقت جمع رہتا تھا، ان کے دلوں میں موبائیل چارج کرنے کی اس درخواست کے جواب میں کئی پھڑکتے ہوئے جملے آتے تھے جو باؤ جی کے خوف سے نوک زبان پہ نہیں آپاتے تھے۔ ورنہ جب باؤ جی خود دکان پہ نہیں ہوتے تھے تو خوب ٹھٹھے اڑتے تھے اور اس جگت بازی میں باؤ جی کا اپنا لڑکا آفتاب پیش پیش ہوتا تھا۔

اصل میں باؤ جی، اگر اس پورے محلے کے نہیں تو کم از کم اپنی گلی کے کوتوال کی طرح تھے۔ اور ان کی دکان کے باہر کھڑے ہونے والے لڑکے ان کے سپاہی! ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو اپنے باپ کی بھی نہ مانتے ہونگے لیکن باؤ جی کے آگے دم نہیں مار سکتے تھے۔ یوں تو گلی کا ہر شخص باؤ جی کا احترام کرتا تھا، یہاں تک کہ دکان پہ سودا سلف لینے کے لئے آنے والے بچے تک ان کے ایک حکم پہ، اپنا سامان چھوڑ چھاڑ، جہاں وہ کہتے، دوڑے چلے جاتے۔ اور یہ احکامات کبھی باؤ جی کے کسی ذاتی کام کے لئے نہیں ہوتے تھے۔ کسی ضعیف کا سودا چھڑوانا ہے، کبھی کسی کی ڈاک پہنچانی ہے، کیونکہ ڈاکیا محلے میں کئی لوگوں کی چٹھیاں، باؤ جی کی دکان پہ دے جاتا تھا، کسی اجنبی مہمان کے ساتھ کسی کے گھر تک بھیجنا ہے۔ بس یہی یا اس جیسے کام ہوا کرتے تھے۔لیکن محلے میں آنے والے ہر اجنبی کو پہلے باؤ جی سے ہونے والی تحقیق و تفتیش کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی محلے کا چوکیدار چھٹی پہ ہوتا تو باؤ جی ہی پہرے کے لئے نوجوانوں کی ڈیوٹیاں لگاتے۔

باؤ جی سرخ و سفید رنگت کے ایک لمبے چوڑے آدمی تھے۔ فوج کے محکمے سگنلز میں نوکری کرتے رہے تھے اور اب ایک زمانے سے ریٹائر تھے۔ اتنے عرصے سے کہ ان کی دکان جس گلی کی نکڑ پہ تھی اس کی شناخت بن چکی تھی۔ اسی دکان سے کما کما کر انہوں نے اپنے کئی بچے باہر بھیجے تھے۔ یہاں صرف آفتاب تھا۔ دکان اب ان کی ضرورت نہیں عادت تھی۔ وہ دن کا زیادہ حصہ دکان پر ہی گزارتے تھے۔ صرف صبح بازار کے چکر کے دوران ان کی جگہ آفتاب بیٹھتا تھا یا سہ پہر کو جب وہ دودھ لینے جاتے تھے۔

آفتاب نوجوان تھا۔ باؤ جی کی آخری اولاد۔ باؤ جی جس قدر سنجیدہ اور رعب والے تھے، آفتاب اسی قدر شریر تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اسکی شرارتوں کے ساتھی بھی وہی لوگ تھے جو باؤ جی کی ٹاسک فورس کے رضا کار تھے۔ دکان کے تھڑے پر ان کارروائیوں کی منصوبہ بندی ہوا کرتی اور یہیں ان کے نتائج سے لطف اندوز ہوا جاتا اور جوس، بوتلوں وغیرہ سے کامیابی کا جشن منایا جایا۔ محلے والوں کو کبھی پتا نہ

چل سکا کہ سردیوں کی راتوں میں کبھی کبھی گلیوں میں گھنگھرو بجاتی پھرتی چڑیل اصل میں ندیم بیگ تھا۔ نہ ہی دتو مسلی کو خبر ہوئی کہ اسے جو صبح ہی صبح مسجد سے نہا کر نکلتے ہی خارش شروع ہوئی تھی، جس نے سارا دن اسے چین نہ لینے دیا تھا، وہ اصل میں اس کڑوے تیل کی برکت تھی جس کی پوری بوتل کرار شاہ نے رات کو ہی مسجد کے حمام میں الٹ دی تھی۔ ان لوگوں کی زیادہ تر شرارتیں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں یا پھر کچھ سازشیں تھیں جن میں ضرر کم اور لطف زیادہ ہوتا تھا اور جن میں سے زیادہ تر کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں۔ کمال یہ ہے کہ محلے کے چوراہے پہ کی جانے والی یہ تمام منصوبہ سازیاں کبھی بے نقاب نہ ہوئیں۔ گاہک کو دور سے آتا دیکھتے ہی اور باؤجی کے دکان پہ آنے کے وقت سے پہلے پہلے ہی موضوع بدل جایا کرتے تھے۔

اس دن جب وہ گلی کی دیوار سے لگی لگی، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دکان پہ پہنچی تو باؤجی بازار گئے ہوئے تھے۔ آفتاب کاؤنٹر پہ کھڑا تھا اور تھڑا اس کے دوستوں سے آباد تھا۔

''موبائل چارج کر دو گے؟''

اس نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔

''آ جا پچھلے اندر۔'' آفتاب نے آنکھ سے اشارا کیا۔ ''آج تیرا موبائل چارج کر ہی دوں۔''

اس نے جواباً موبائل کے پیکٹ پہ اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

''کس یار کے فون کا انتظار ہے تجھے جو فون چارج کروانا ہے؟'' تھڑے پہ سے کسی نے پوچھا۔

''موبائل چارج کر دو گے؟'' اس نے دوبارا پوچھا۔

''مائی پھینک دے اس موبائل کو، تجھے نیا لے دوں گا۔'' ظفر گجر نے پیشکش کی۔

''تیرے موبائل سے تو مائی بیٹری کا موبائل اب بھی اچھا ہے۔'' ندیم بیگ نے ظفر سے کہا۔ ''جا مائی جا، کوئی نہیں چارجنگ وارجنگ ہوتی۔ ایویں کوئی بیماری لگاتی ہے۔''

اس پہ ایک قہقہہ لگا اور مائی اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا پیکٹ دبائے ہوئے وہاں سے چل دی۔

''یار ایک آئیڈیا ہے۔'' آفتاب نے کہا۔ ''اگر مائی کا موبائل اٹھا لیں۔''

یہ آئیڈیا فوراً ہی سب کی مہم پسند طبیعت کو بھا گیا۔ اصغر عرف بلیک زیرو نے یہ ذمہ داری بخوشی اپنے سر لے لی۔ وہ عمران سیریز پڑھ پڑھ کر خود کو کسی جاسوس سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے تئیں تو وہ سیکریٹ سروس کا چیف عمران ہی تھا لیکن یار دوستوں نے اس کا نام عمران کی ڈمی کے نام پہ بلیک زیرو رکھ دیا تھا۔ وہ اس پہ قانع تھا۔

''صبح دکان کھلے گی تو موبائل تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔'' اس نے آفتاب کو یقین دلایا۔

دکان صبح اذانوں کے وقت کھلتی تھی۔ باؤجی تو مسجد جاتے تھے اور آفتاب جھاڑ پونچھ کر کے سامان لگاتا تھا اور کاؤنٹر سیٹ کرتا تھا۔

اگلی صبح ابھی دنیا سو رہی تھی جب اصغر شاپنگ بیگز کا بنڈل اٹھائے تھڑے پہ پہنچا۔ اس کے کئی ساتھی پہلے سے وہاں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بنڈل کے ساتھ بندھی ہوئی ڈوری کٹی ہوئی تھی۔ آفتاب نے جلدی جلدی کاؤنٹر کے اندر لگی ہوئی لائیٹ کی روشنی میں اس کے اوپر لپٹے نائیلون کے غلاف اتارنے شروع کئے۔

''اوئے موبائل تو مائی کا بڑا اصاف ہے۔'' واقعی آفتاب کے ہاتھ میں موجود سیاہ سکرین کا موبائل بالکل بے داغ تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک مائی بیٹری جیسی گندی مندی عورت کے پاس تھا۔

''باریک پن کا چارجر ہے تیرے پاس؟'' ندیم بیگ نے موبائل کو الٹتے پلٹتے ہوئے آفتاب سے پوچھا۔

''ہوگا ضرور۔'' آفتاب نے کاؤنٹر کی درازوں میں ڈھونڈنا شروع کیا اور آخر ایک ایسا چارجر نکال ہی لیا جو اس موبائل کے لئے درست تھا۔ اس نے موبائل چارجنگ پہ لگایا تو بجلی جانے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔

''اس میں اب کیا جان ہوگی، پتا نہیں کب سے لئے پھر رہی ہے۔'' اصغر نے کہا۔

''اوئے نہیں یار، کئی بیٹریاں بڑی ڈھیٹ ہوتی ہیں۔'' ظفر گجر نے کہا۔

''جیسے ہماری مائی بیٹری۔'' ندیم بولا اور سب ہنس پڑے۔

موبائل کی سکرین روشن ہوگئی تھی۔ ان سب کی نگاہیں ایک تصویر پہ جم گئیں۔ وہ دو بچے تھے۔ پانچ اور دس سال کے درمیان کی عمروں میں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں والے، مسکراتے ہوئے خوبصورت بچے۔ باہر گلی میں کچھ شور ہوا۔ مائی بیٹری چیختی چلاتی ہوئی ہیجڑوں کی حویلی سے نکل آئی تھی۔ پہلی بار موبائل کے چارج کرنے کی درخواست کے علاوہ کوئی اور بات اس کے منہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔

''میرے بچے۔ میرے بچے۔''

 

کلینک پہ ایک شام

کلینک پہ خاصی رونق تھی۔ مریض تو خیر ایک گھنٹے سے کوئی نہیں آیا تھا لیکن اتفاق سے تین ایسی ہستیاں ضرور موجود تھیں جوان دنوں کم کم ہی اکٹھا ہوتی تھیں۔۔فواد، سرمد اور باری۔ سرمد اپنے مخصوص انداز میں ایک کرسی پہ آڑا ترچھا، ٹیڑھا میڑھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی اس موجودگی کے بارے میں فواد کا کہنا تھا کہ ''یہ بیٹھی یا لیٹی پوزیشن نہیں ہے بلکہ آکوارڈ پوزیشن (Awkward Position) ہے۔'' اس کے ساتھ والی کرسی پہ باری اپنے کلف لگے کپڑوں کو جسقدر ممکن ہو سلوٹوں سے اور سرمد کی اس آکوارڈ پوزیشن کے باعث اس کی اپنی کرسی کی حدود سے متجاوزات کی مضرتوں سے بچانے کے لئے کچھ محتاط سا بیٹھا تھا۔ فواد مریض لٹانے والے کاؤچ پہ دراز تھا۔ بات کرکٹ کے کھلاڑیوں اور سیاستدانوں پہ تنقید اور پیری فقیری پہ تبصرے سے ہوتی ہوئی وہیں پہنچ گئی تھی جہاں ایسے موقعوں پہ ہمیشہ پہنچتی تھی، یعنی میری پریکٹس کی ناکامی کے اسباب۔

حامد باری ان لوگوں میں سے تھا جو ایک بار کوئی نظریہ یا عقیدہ اپنا لیں تو پھر ہمیشہ اسی پہ یقین رکھتے ہیں۔ علم، تحقیق، شواہد۔ کوئی چیز ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتی۔ نہ ہی وہ اس سلسلے میں ان چیزوں کی ضرورت کے قائل ہوتے ہیں۔ فواد کے خیالات مطالعے سے اور ایسے لوگوں کی گفتگو سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے جو اس کے خیال میں ذہین اور انٹلیکچوئیل تھے۔ سرمد اس کے بارے میں کہا کرتا تھا، ''فواد نے فلم دیکھ تو لی ہے، اب وہ ناصرہ سے پوچھ کر بتائے گا کہ اسے پسند آئی ہے کہ نہیں۔'' ناصرہ یونیورسٹی میں فواد کی کلاس فیلو تھی جو ان دنوں اپنی غیر معمولی ذہانت اور وسیع مطالعے کی وجہ سے فواد کے حواس پہ سوار تھی۔ خود سرمد کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ کسی سلسلے میں کیا نکتۂ نظر رکھتا ہے کیونکہ وہ بحث کی خاطر اکثر نظریات تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اسے بحث کا اس قدر شوق تھا کہ اگر وہ اپنے مخاطب کو قائل بھی کر لے تو اس کا دل چاہتا تھا کہ نئے سرے سے گفتگو کا آغاز کرے اور ابھی تک وہ جس چیز کے حق میں بات کر رہا تھا، اب اس کے خلاف دلائل دینا شروع کر دے۔

سرمد کا خیال تھا کہ میرے پاس مریضوں کا رش نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ میرا 'غیر پیشہ ورانہ رویہ' تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اسی رویے کو میں عین پیشہ ورانہ سمجھتا تھا۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ معائنے سے پہلے میڈیکل ہسٹری لینے کی کوشش کرتا تھا، غیر ضروری ٹیسٹ نہیں لکھتا تھا اور ٹیکوں اور انفیوژن وغیرہ سے حتی الامکان اجتناب کرتا تھا۔ میں مریض کی خواہش کی بجائے اپنی مرضی پہ چلتا تھا۔ سرمد کا کہنا تھا کہ مجھے اپنے مریضوں کو گاہک سمجھنا چاہیے۔

''۔۔۔۔اور کسٹمر از آلویز رائیٹ(Customer is always right)، آپ اس سے جونسا ہے، بحث شروع کر دیتے ہیں۔اس سے مت الجھیں۔اس کی خواہش جو ہے اس کا احترام کریں۔وہ ٹیکا لگوانا چاہتا ہے، آپ لگا دیں۔چاہے بی کمپلیکس یا ڈسٹلڈ واٹر ہی لگا دیں۔وہ جونسا ہے، ڈرپ لگوانا چاہتا ہے، ٹھوک دیں۔اچھا، آپ مجھے بتائیں، ڈرپ لگوانے سے بندہ مرتا تو نہیں نا؟''

''مر بھی سکتا ہے۔''میں نے کہا۔پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے جلدی سے اضافہ کیا:''عموماً نہیں۔''

''بس پھر لگائیں۔اس میں رنگ برنگے ٹیکے ڈالیں۔اس دن معین کی کچھ طبیعت خراب تھی۔شاید لمبے سفر کے بعد تھکان کی وجہ سے، جونسا ہے کوئی چکر و کر آ گئے۔وہ ڈاکٹر زبیر کو دکھانے گیا۔انہوں نے بی پی، شی پی دیکھ، فوراً کمپوڈر سے کہا، فلاں ڈرپ لگاؤ۔فلاں فلاں ٹیکے ڈالو، یہ کرو، وہ کرو اور جونسا ہے جلدی کرو۔اور جناب پانچ چھ سو کا بل بنا دیا۔آپ بھی لگائیں۔''

''لگاتا ہوں بھئی، لگاتا ہوں۔جہاں۔۔۔۔''

''۔۔ضرورت ہو ضرور لگاتا ہوں۔''فواد نے میرا فقرہ بالکل میرے ہی الفاظ میں مکمل کیا۔''یار ایک تو تم اپنا نظریہء ضرورت تبدیل کرو۔مریض کی میڈیکل ضرورت کے علاوہ اس کی نفسیاتی ضرورت کو بھی سمجھو اور اپنی کمرشل ضرورت کو بھی۔اور یہ مریضوں کو ایجوکیٹ(educate) کرنا چھوڑ دو۔کل وہ بابا جی نے سٹول پہ بیٹھ کر جیسے ہی نبض دکھانے کو ہاتھ بڑھایا، تم نے ہسٹری کی اہمیت پر لیکچر جھاڑنا شروع کر دیا۔بھائی صاحب یہ ڈھلے ڈھلائے ذہنوں والے لوگ ہیں۔یہ تمہاری بات نہیں سمجھ سکتے۔ان کی ہسٹری کا سوئچ کلائی میں لگا ہوا ہے۔تم نبض پکڑو وہ خود ہی تفصیل بتانا شروع کر دیں گے۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔''باری نے فواد کی بات کاٹی۔''میں نے انہیں پہلے بھی کئی بار کہا ہے، منڈھ کے فیس لیں، دوا مہنگی لکھیں اور یہ ڈسپنس(dispense) کرنا چھوڑ دیں۔صرف لکھ کے دیا کریں دوائی۔آپ دیکھیں کیسا رش لگتا ہے۔''

''باری صاحب، آپ کی تجویز نہایت عمدہ ہے۔بات فقط اتنی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔فیس تو میں لوگوں کی استعداد اور اپنی قابلیت، اور پھر ان خدمات کے مطابق ہی لے سکتا ہوں جو میں انہیں فراہم کرتا ہوں۔جہاں تک تعلق ہے پریسکرپشن کا، تو بھائی جی یہ ہے جنرل پریکٹس۔یہاں تو پھوڑے پھنسیوں والے مریض بھی آتے ہیں۔ان کو اگر میں فیس لے کر پرچی پکڑا دوں کہ دوائیں باہر سے خریدتے پھریں تو پرچی میرے منہ پہ ماریں گے۔یہاں پٹی کروانے بھی لوگ آتے ہیں۔گردے کی تکلیف کے ساتھ کوئی مریض آتا ہے تو مجھے تو فوری طور پر کوئی پین کلر(pain killer) لگانا پڑتا ہے۔۔۔''

''خیر یہ تجویز تو باری کی افسرانہ طبیعت کا نتیجہ ہے، گو اتنی بری بھی نہیں جتنا کہ تم نے اسے سمجھا ہے۔لیکن بہر حال تجزیہ تو کرنا چاہئے کہ آخر وجہ کیا ہے اس ناکامی کی۔''

''دیکھیں جی، میں بتاتا ہوں۔''سرمد ایک کوشش کے ساتھ سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا بولا۔مجھے یقین تھا کہ اگر اسے بات کے اچک

لئے جانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ بولنے سے پہلے اپنی تقریر کا پورا لطف اٹھانے کے لئے کھنکھار کر گلا صاف کرتا اور سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش ضرور لیتا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ذرا جلدی آنا چاہئے۔ آپ صبح کلینک پہ بہت لیٹ آتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ اس کا سارا کاروبار جونسا ہے، مضافات کے دیہاتوں سے آنے والے لوگوں پر ڈیپینڈ (depend) کرتا ہے۔ یہ لوگ سویرے سویرے گھروں سے نکلتے ہیں، شہر کے بازار سے سودا سلف لے کر، اپنے ضروری کام جلدی جلدی نمٹا کر، جن میں دوا دارو لینا بھی شامل ہے، دوپہر سے پہلے پہلے عورتیں جونسا ہے واپس اپنے گاؤں کو اور مرد اکثر کورٹ کچہری کے چکروں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جو ڈاکٹر وقت پہ نہ ملے، دوسری بار اس کے کلینک پہ جانے کا رسک (risk) نہیں لیں گے۔ ایک بات۔۔۔! پھر خدا کے لئے اپنے مریضوں کو سپیشلسٹ ڈاکٹروں کے حوالے نہ کیا کریں۔ یقین کریں بڑا خراب کرتے ہیں، فلاناٹیسٹ کرواؤ، یہ کرو وہ کرو، یہ سپیشلسٹ لوگ تو جونسا ہے دوائی شروع کرانے میں ہفتے لگا دیتے ہیں۔"

"لیکن یار، کچھ کیسز (cases) میں یہ ضروری ہوتا ہے، میں سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اب فرض کرو ایک بندہ چھاتی میں درد کے ساتھ آتا ہے، میرے پاس تو ای سی جی مشین بھی نہیں ہے۔۔۔"

"تو رکھیں۔" سرمد نے فوراً کہا۔ "آپ کو پتا ہے وہ کارڈیالوجسٹ اس بیچارے مریض کے ساتھ کیا کرتا ہے جو آپ جونسا ہے اس کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ دوسرے جناب، آپ اپنا رویہ کچھ تھوڑا سا تبدیل کریں۔ یہ روکھا پھیکا، کام سے کام رکھنے والا جونسا ایٹی ٹیوڈ (attitude) ہے، یہ مریضوں کو اکثر پسند نہیں آتا۔ یہاں کام تبھی چلے گا جب آپ لوگوں سے تعلق پیدا کریں گے۔ جان پہچان بنائیں، فارغ وقت میں لوگوں سے ملیں، مریضوں سے گپ لگائیں، ان کے جونسا ہے، دوست بن جائیں، فیملی ممبر بن جائیں۔۔۔"

"مریض خوبرو ہو اور صنف مخالف سے ہو تو ڈاکٹر صاحب اس اصول پہ بھرپور عمل کرتے ہیں۔"

سیکنڈ کے کسی حصے میں یہ فقرہ، الفاظ کی اسی ترتیب کے ساتھ پہلے میرے ذہن میں آیا اور پھر فواد کی آواز میں سنائی دیا۔ ہم دونوں بھائیوں میں ایک ٹیلیپیتھک ریپو (telepathic rapport) موجود تھا۔ ذہنی ہم آہنگی، مفاہمت اور سوچ کے زاویوں میں مماثلت تو تقریباً سبھی بہن بھائیوں میں ہوتی ہے لیکن ہم دونوں میں اس کا وقوع بعض اوقات حیرت انگیز ہوتا تھا۔ ایک بار تو ہم بیک وقت ایک ہی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ پھر یہ بھی ہم پہ ایک ساتھ ہی کھلا کہ وہ ہم دونوں کو بیوقوف بنا رہی ہے۔

"ایک اور مشکل یہ ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بنیادی مسئلہ بھی یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب عمر کے ایسے چور ہیں، شکل سے اتنے نوجوان دکھائی دیتے ہیں کہ اول تو مریضوں کو یقین ہی نہیں آتا کہ بھائی جان ڈاکٹر ہیں اور اگر یہ مان بھی لیں تو پھر وہ ایسے ناتجربے کار ڈاکٹر کو دکھانے کا رسک (risk) نہیں لینا چاہتے۔"

حامد باری نے فوراً سرمد کی تقریر میں دخل اندازی کے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ سرمد نے سگریٹ والی دو انگلیاں اٹھا کر ''دو منٹ'' کہا بھی لیکن اس کی باری گزر چکی تھی۔

''ویسے اگر تم مونچھیں رکھ لو اور سادا چشمہ لگایا کرو تو کچھ نہ کچھ میچیور لک (mature look) دو گے۔'' فواد نے تجویز دی۔

''میرے عزیز بھائیو! مجھے پتا ہے کہ کسی پہ تنقید اور تبصرہ کس قدر آسان اور دلچسپ کام ہے اور اس کی کشش سے دامن بچانا کتنا مشکل ہے اور پھر پروفیشنلز (Professionals) کی اصلاح کے لئے تو تجاویز خود بخود نکلتی چلی آتی ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ مجھ سے کئی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہونگی۔ رویے میں بھی اور شاید کلینیکل اپروچ (clinical approach) میں بھی، لیکن معاملہ جب بھی لوگوں کی نفسیات کا ہو تو آپ کوئی بھی ایک اصول وضع نہیں کر سکتے جو سب پہ لاگو ہو۔ ہر بندے کا متاثر ہونے کا پیمانہ، پسند کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مہنگی دوا سے، اونچی فیس سے مرعوب ہوتے ہیں۔ کچھ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ ڈاکٹر سستا ہے۔ کچھ کو نوجوان ڈاکٹر پسند ہیں کہ نالج فریش ہوگا، کچھ چاہتے ہیں کہ تجربے سے مالا مال ہو۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو ڈاکٹر جتنی زیادہ انگلش بولے گا، اتنا ہی پڑھا لکھا اور قابل ہوگا اور کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی زبان بولنے والا ڈاکٹر ان کی تکلیف زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے۔ میں سیکھ رہا ہوں۔ درحقیقت ۔۔ میں اپنے مختصر سے تجربے سے سمجھا ہوں کہ ۔۔ خوش خلقی، نخوت، لیاقت، دیانت، یہاں تک کہ محنت، کسی شخص کی کامیابی کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ۔۔۔ اگر کوئی حیثیت رکھتی بھی ہیں تو۔ میں ایسے ڈاکٹرز کو جانتا ہوں جو نہائت غصہ ور ہیں اور مریض ان پہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ میں نے یہاں کے کامیاب ترین ڈاکٹرز کے نسخے دیکھے ہیں جن سے ان کی قابلیت کا پول کھل جاتا ہے۔ بھائی جی آخر آپ قسمت کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں جو کامیابی اور ناکامی کا سب سے بڑا کرائی ٹیریئن (criterion) ہے۔''

''قسمت ۔۔'' سرمد نے کچھ کہنا چاہا۔

''قسمت ایک مس کانسیپشن (mis-conseption) ہے، ایک مس انٹرپریٹیشن (mis-interpretation)۔'' فواد نے کہا۔

''کوئی مس کانسپشن وغیرہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ قسمت بس قسمت ہے جس کے آگے ہماری ساری صلاحیتیں، ہمت، محنت ۔۔۔ سب کچھ ۔۔۔ مجبور ہے۔''

''۔۔۔ ہیچ ہے۔'' میں نے باری کا فقرہ درست کیا۔

''او چھوڑیں ڈاکٹر صاحب، یہ قسمت وسمت سب ایکسکیوز (excuse) ہیں، کمزوروں اور بزدلوں کے لئے۔ نااہلی چھپانے کا بہانہ۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی۔'' سرمد دوبارا اپنی سابقہ انداز نشست اختیار کرتا ہوا بولا۔

''میں تو نہیں جانتا۔'' میں نے غصے اور شرمندگی کے ملے جلے احساس کو کوشش کے ساتھ دبایا اور خود کو یقین دلایا کہ میرے کانوں

کی لویں سرخ نہیں ہوئی ہونگی۔" "دیکھو بھائی، ایک زمانے میں میں بھی تمہاری طرح یہی سمجھتا تھا کہ جو چیز میرے محدود علم اور منطق کے پیمانے پر نہیں تلتی وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔۔ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ایسے رنگ ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے، ایسی آوازیں ہیں جو ہم سن نہیں سکتے اور ایسے قوانین، اصول اور ایسے فینومینا (phenomina) ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ہم دو یا تین جہتوں کے قیدی، اپنی پانچ حسیات کے پابند کتنا کچھ جان سکتے ہیں۔کیا کچھ جان سکتے ہیں۔جتنی آنکھیں پھاڑتے ہیں، اندھیرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔خلا میں ایسے علاقے ہیں فزیسسٹ (physicist) جنہیں سنگولیریٹیز (singularities) کہتے ہیں۔ جہاں ہماری اس عقل کے وضع کئے ہوئے قوانین نہیں چلتے، سائنس کے لاز (laws) وہاں اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ بلیک ہولز کے بارے میں تو تم نے بھی خاصا پڑھا ہے۔ بلکہ ہمارے آس پاس بیشمار ایسی باتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔اماناً دفن کی جانے والی لاشیں جنہیں زمین کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔۔۔۔"

"ابھی پچھلی سوموار کو۔۔۔۔۔آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔۔۔۔۔میں چک عمرا گیا تھا۔پنڈی روڈ پہ ایک گاؤں ہے یہاں سے دس بارا کلومیٹر کے فاصلے پہ سن پینسٹھ کے ایک شہید کی قبر کی زیارت کرنے۔" باری نے بتایا۔"حالانکہ آپ کو پتا ہی ہے کہ میں ان زیارتوں ویارتوں کے کتنا خلاف ہوں۔واقعہ کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دوست کے چچا کا انتقال ہو گیا پچھلے دنوں۔وہی 'مکہ موٹرز' والے یوسف کے چچا۔انکی قبر کی کھدائی کے دوران اتفاق سے ساتھ والی قبر کھل گئی۔اصل میں کچھ عرصہ پہلے رواج تھا، میت کو قبر کی سائیڈ میں دفن کرتے تھے۔یعنی پہلے قبر کھودی، پھر اس کی ایک طرف کی دیوار میں مزید کھدائی کر کے جگہ بنالی۔۔۔۔"

"اسے سامی کہتے ہیں۔" سرمد نے کہا۔"کئی دیہاتوں میں، جہاں قبرستانوں میں گنجائش ہو، ابھی بھی یہی پریکٹس ہے۔"

"یوسف کے چچا کے لئے کھدائی جس قبر کے ساتھ ہوئی، وہ پینسٹھ کی جنگ کے ایک شہید کی تھی۔وہ بھی اسی طرح سائیڈ میں دفن کئے گئے ہونگے۔کھدائی گہری ہوئی تو انکی میت ایکسپوز (expose) ہوگئی۔اور اس کے ساتھ ہی لوگوں نے تین حیرت انگیز مشاہدے کئے۔"

"ایک تو میں بتا دیتا ہوں۔" سرمد نے پھر بات کاٹی۔"میت بالکل محفوظ ہوگی۔ایسی تمام کہانیوں میں یہی ہوتا ہے۔"

"ہاں واقعی بالکل ویسی کی ویسی جیسا دفنایا گیا تھا، یہاں تک کہ کفن تک ٹھیک حالت میں تھا۔دوسرے سارا گاؤں ایک خوشبو سے بھر گیا۔اب ڈاکٹر صاحب، اب جب کہ میں وہ قبر دیکھنے گیا ہوں تو قبرستان میں وہ خوشبو ابھی تک باقی تھی۔اور تیسری اور سب سے بڑی بات یہ کہ شہید اپنی دائیں کروٹ لیٹے تھے حالانکہ دفن کے وقت انہیں سیدھا رکھا گیا تھا۔گاؤں میں ایسے لوگ موجود تھے جو ان کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔ان لوگوں نے بتایا کہ انہیں سیدھا لٹایا گیا تھا۔"

باری چپ ہوا تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز جیسے گم ہوگئی تھی۔فضا پر ایک رعب سا طاری تھا۔ کچھ دیر بعد سرمد بولا۔"اب میں آپ کو بتاتا ہوں، میں شرط لگا سکتا ہوں کہ باری ایسے کسی ایک بھی شخص سے نہیں ملا ہوگا جس نے وہ شہید کی

میت جو ہے وہ خود دیکھی ہوگی، خوشبو ایسے موقعوں پہ لوگوں نے لگائی ہوئی بھی ہوتی ہے اور کچھ وہ لڑکے وغیرہ گلاب کے عرق وغیرہ کا چھڑکاؤ بھی کررہے ہوتے ہیں، رہی بات میت کے سیدھا ہونے کی تو جن بزرگوں نے آج سے تیس چالیس سال پہلے انہیں دفنایا ہوگا، اب ان کی یادداشت پر کتنا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔''

''او چھوڑ یار، تیرا تو کام ہی ہے ہر بات میں شک کرنا۔ نئے نئے نکتے نکالنا۔ ساری دنیا ایک بات کہے گی تو دوسری کہے گا۔'' باری چڑ کر بولا۔

''تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں، یا جو بھی واقعات اور حادثات ہمیں پیش آتے ہیں، پہلے سے سب کچھ کہیں لکھ رکھا ہے۔ ہر بات طے شدہ ہے۔ یہ جونسا سکہ اچھلتا ہے تو پہلے سے کہیں لکھا ہے کہ اب یہ کس رخ پہ گرے گا۔'' سرمد نے باری کے غصے کے جواب میں صرف ایک مزید چڑا دینے والی مسکراہٹ کو کافی سمجھا اور گفتگو کو تقدیر کے موضوع پر واپس لانے کی کوشش کی۔

''میں کچھ سمجھتا وجھتا نہیں ہوں۔ ہاں ایمان رکھتا ہوں تقدیر پہ۔ ویسے تمہیں پتا ہے میٹا فزیسسٹس (Meta physicists) کا ایک گروپ اس بات پہ یقین رکھتا ہے کہ بگ بینگ سے لے کر سکے کے رخ تک کی ہر چیز، بلکہ ایٹموں کی حرکت اور ایلیکٹر انز کی گردش تک ہر ہر بات پہلے سے طے شدہ ہے۔''

''غصہ جان دیو ڈاکٹر صاحب، میٹا فزیسسٹس کون سا سائنسدان ہوتے ہیں؟ میں تو انہیں فلسفی سمجھتا ہوں، سرجی گل کرو کوئی لاجیکل، کوئی سمجھ میں آنے والی۔'' ہم سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ سرمد اگر کسی کام میں اچھا تھا تو وہ مخاطب کو چڑانا تھا۔''آخر آپ جینز (genes) کی مثال کیوں نہیں دیتے۔ بندے کے جسم کا ایک ایک خلیہ، اس کی ساخت اور عمل، اس میں ہونے والی ممکنہ خرابیاں، انسان کی جونسا ہے شخصیت، اس کا رویہ، ہر چیز کی تفصیلی معلومات۔۔۔ بلکہ احکامات اس ننھی سی فائل میں بند ہوتے ہیں۔''

''میرے عزیز، میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہر بات، ہر چیز اور ہر فینومینن ہماری سمجھ میں آسکے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ صدیوں سے جو کام جس طرح انجام پاتے آرہے ہیں انہیں اسی طرح ہوتے دیکھنے کی عادت نے ان کا غیر معمولی پن اور اچھنبا ختم کردیا ہے ورنہ دنیا میں ہونے والا کوئی بھی فعل پوری طرح سمجھ میں آنے والا اور معمولی نہیں ہے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً، مثلاً۔۔۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ہمیں اس سارے عمل میں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن کیا واقعی یہ سارا عمل ایسا ہی سادا اور قابل فہم ہے یا پھر ہم نے اس کے میکانزم کو سمجھنے کی بجائے بس ایک حقیقت کے طور پہ تسلیم کرلینے پر اکتفا کرلیا ہے ورنہ دیکھو نا، تکسیدی عمل تک پہنچ جانے کے بعد ایک آدھ ''کیوں'' اور ہو تو ہمارے علم اور فہم کی بے بسی کے لئے کافی ہو جائے گا۔ سادا الفاظ میں یوں کہئے کہ آگ کا جلانے کا عمل اپنی اصل کے اعتبار سے آج بھی ایسا ہی چونکا دینے والا اور غیر معمولی

ہے جیسا کہ اس پہلے انسان کے لئے رہا ہوگا جس نے پہلے پہل اس کا مشاہدہ کیا تھا لیکن صدیوں سے اسے دیکھتے چلے آنے ،اس کے پیچھے کارفرما عوامل کو دریافت کر لینے ،اوران عوامل کو اپنے بہت سے دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بعد ہم اس کو معمولی اور نارمل سمجھنے لگے ہیں۔

آگ کے جلانے کے عمل کے علاوہ کوئی بھی اور مثال لے لیجئے ،وہ پانی کے بہنے کی، چیزوں کے اس میں ڈوبنے یا اس پہ تیرنے کی عادت ہو، پرندوں کے ہوا میں اڑنے کی صلاحیت ہو یا کوئی اس سے بھی زیادہ معمول کی بات یعنی اچھالنے پہ پتھر کے واپس زمین پر آ گرنے کی بات ہو، ذرا سا غور کرنے پہ آپ اس کا غیر معمولی پن دریافت کر لیں گے۔زیادہ سے زیادہ توجیہ جو آپ معلوم کر سکیں گے وہ کسی بھی طبعی یا طبیعی قانون کا سہارا ہوگا جیسے کہ کشش ثقل کا قانون، حرکت کے قوانین، یا پھر ارشمیدیس یا پاسکل کے قوانین وغیرہ۔لیکن یہ قانون اس طرح کیوں ہے، اس کی کوئی وضاحت پانا ممکن نہیں۔''

''میں جو تمہاری تقریر سے سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ۔'' فواد نے کہا۔'' سائینس شاید صرف کیا اور کیسے کا جواب پا سکتی ہے، 'کیوں' کا نہیں۔''

''اگز یکٹلی۔'' میں نے جوش سے کہا۔'' اور اس کیوں سے نمٹنے کے لئے روائتی دینی علماء کی طرح سائنسی علماء نے بھی تھیوری اور قانون کی دیواریں اٹھائی ہیں اور اصطلاحات کے بند باندھے ہیں۔وقت کا معمہ نہیں سلجھا تو زیرو ٹائم، تخلیق کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا تو Creativity Field، یا Physical Singularity، کائنات کے توازن اور مادے کی مقدار میں اعتدال کی مساوات ڈگمگائی تو Dark matter پیدا کر لیا گیا۔الغرض سوالات کی ان پیچیدہ اور تاریک راہوں میں سائنس جہاں تک اپنے تجسس اور طریقہء کار کی مشعلیں اٹھائے چل سکی ہے چلی ہے لیکن جہاں اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ ان مشعلوں کی لو جواب دے جائے وہاں سائنس نے کسی ایک اصطلاح کا بورڈ ٹھونک دیا ہے اور اس سے آگے کے راستے کو اپنے لئے غیر متعلق قرار دے دیا ہے۔''

''یہ بات تو طے ہے کہ یہ سائینسدان لوگ بھی عین مین ہمارے سو کالڈ (so called) دینی علماء کی طرح جونسا ہے، ریجڈ (rigid) اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔''

''آپ دونوں ثابت کیا کرنا چاہ رہے ہیں؟'' میری توقع کے مطابق باری کی سمجھ اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔دینی علماء کا نام آتے ہی وہ چوکنا ہو جاتا تھا۔لیکن اس سے پہلے کے سرمد اس کی اس کیفیت سے لطف اٹھاتا اور بات مزید آگے بڑھتی، ایک مریض آ گیا اور ان تینوں کو میرے کیبن سے باہر جانا پڑا۔

میں مریض بھگتا کر فارغ ہوا تو گفتگو کا مزاج بدل چکا تھا۔

''کیا بات ہے، آج بالکل فارغ بیٹھے ہیں۔'' سرمد نے پوچھا۔'' میرا مطلب ہے مریض تو خیر پہلے بھی کوئی نہیں آتا تھا، آج تو

کوئی فون بھی نہیں آیا ابھی تک۔''

''ہاں علی بھائی، یہ فون والا چکر کہاں تک پہنچا ہے، اور یہ معاملہ ہے کیا؟'' باری نے چونک کر پوچھا۔

''سودا ہو میر کو تو کیجیے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دیوانے کو عشق ہے''

فواد نے کہا۔

''خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار۔۔۔'' میں نے جواباً مصرع پڑھا۔

''اچھا تو سارا چکر خواہش کا ہے؟ ہمارا تو پہلے سے یہی خیال تھا۔'' سرمد نے کہا۔

''پتا نہیں تم کس خواہش کا ذکر کر رہے ہو، اور میرا مطلب کس سے ہے؟''

''میں تو جناب اسی خواہش کا ذکر کر رہا ہوں، جس کا غالب نے کیا ہے۔''

''خیر یہ بھی ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے اور جہاں تک میری خواہش کا تعلق ہے تو۔۔۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پتا نہیں یہ تجسس ہے، کوئی ضد ہے یا پھر۔۔''

''محبت ہے۔'' باری نے لقمہ دیا۔

''پتا نہیں یار، کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' میں نے گھومنے والی کرسی پہ کچھ زیادہ آرام دہ نشست اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں کبھی کھل کے، ہار کے محبت نہیں کر سکا۔ میری محبت میں ہمیشہ اپنی ذات کی اہمیت کا کھوٹ شامل رہا ہے۔ کتنی آسانی ہوتی ہوگی ان کے لئے جو آرگیومنٹس سے، قیل وقال سے کام نہ لیتے ہوں، بس محبت کرتے ہوں۔ کیا کچھ لوگ ایسے نہیں ہوتے جن کو دیکھ کر، جن سے مل کر یا۔۔۔ جن کی فقط آواز سن کر ہمت نہ ہارنا، عقل سے کام لینا، وہ ساری باتیں سوچنا جن میں ادلے بدلے کے، نتائج کے سارے پہلو نکلتے ہوں، غیر فطری ہو جاتا ہے۔ کیا ایسے لوگ خدا کی واضح دلیلوں میں سے نہیں ہوتے کیونکہ یہ آپ کو عمل اور ردعمل کی سائنس اور معمولی عقل کی حدوں سے باہر کھینچ لاتے ہیں۔''

''پر یہ محبت۔۔۔۔'' باری نے کچھ کہنا چاہا۔

''محبت شاید اس طرح کسی بدنصیب پر حملہ آور ہوتی ہے جیسے کوئی لاپرواڈرائیور کسی راہ چلتے کو ٹکر مار دے، یا جیسے کسی پہ بجلی گر جائے۔ یا پھر دلوں کو رفتہ رفتہ یوں گرفت میں لے لیتی ہے، روز صفائی نہ ہو تو جس طرح بند دروازے کھڑکیوں کے باوجود گھر کے قالین، فرنیچر اور بستروں کی چادروں کو دھیرے دھیرے گرد ڈھانپ لیتی ہے۔ کیا ایک شخص صرف اس لئے ہیرو سے ولن میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ جب اس پر محبت۔۔۔ نازل ہوتی ہے تو وہ ایک محبت کرنے والی، محبوب بیوی کا شوہر ہو ایک بچے کا باپ بھی۔ کیا ایک بندے کو ناپ

تول کر محبت کی اتنی ہی مقدار عطا کی جاتی ہے کہ وہ ایک وقت میں کسی ایک ہی سے محبت کر سکے؟''

''بہر حال، سرمد کی بات میں وزن ہے۔'' فواد نے کہا۔'' خواہش کو آپ کسی صورت نیگیٹ (negate) نہیں کر سکتے۔ محبت کو آپ جسمانی تعلق سے مربوط کریں یا نہ کریں، اس کا آخری نتیجہ یا ممکنہ منزل اس کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ ورنہ جس محبت کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کسی ایسے انسان سے کیسے ہو سکتی ہے جو کبھی خامیوں سے پاک نہ ہو سکتا ہو، اور جس کی ساری خوبیاں عارضی ہوں۔ اور جہاں تک تعلق ہے آپ کی اس معمولی عقل سے ماورا ہونے کی بات تو جناب یہ جبلت کا، انسٹنکٹ (instinct) کا تقاضا ہے جب سر چڑھ کر بولتی ہے تو کچھ اور نہیں سوجھتا۔''

''یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ۔۔۔''

''دیکھو جی بات سیدھی سی ہے، اللہ پاک نے دو چیزیں جانور میں، بشمول اس حیوان ناطق کے، بہت طاقتور رکھی ہیں۔ ایک بھوک اور ایک شہوت۔ کس لئے؟ اس کی بقاء کی خاطر۔ اگر ہمیں بھوک نہ لگتی اور صرف زندہ رہنے کے لئے کھانا کھانا ہوتا تو ٹالتے ہی رہتے۔ کون اتنی مصیبت بھرے، پکائے اور کھائے۔ چلو کل کھا لیں گے۔ ابھی تو اتنی کمزوری نہیں ہوئی۔ اچھا ابھی کھاتے ہیں۔ ابھی بس کچھ دیر میں۔۔۔ اور فاقوں سے مرتے رہتے۔ اسی طرح اگر سیکس (sex) کے مزے نہ ہوتے تو یہ جسمانی ملاپ والا اوکھا کام مشکل ہی کوئی کرتا، صرف بچے پیدا کرنے کے لئے۔ نہ بھئی نہ۔ اچھا پھر سہی، ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے۔ چنانچہ ان دونوں بنیادی ضرورتوں کو خالق نے مخلوق پر نہیں چھوڑا۔ انہیں بھوک اور لذت کی ایسی مضبوط ڈوریوں سے باندھا ہے کہ سستی اور غفلت کا امکان ہی نہ رہے۔ پھر ہوا یہ کہ سوفسٹیکیشن (sophistication) نے، تہذیب کے ارتقائی عمل نے اپنے سفر میں کسی جگہ ان کو لباس پہنا دیے۔ بھوک کو ذائقے کا اور شہوت کو محبت کا۔۔۔

ہو سکتا ہے محبت کے دوران کسی سٹیج پہ آپ جسمانی ربط کی خواہش سے بے نیاز رہیں اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اسی بناء پر محبت کو ایک پاکیزہ اور جنسی تعلقات سے ماورا جذبہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اول تو یہ اس کے پاکیزہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جسمانی تعلقات ناپاک ہوتے ہیں جبکہ تخلیق کی بنیادی صورت یہی تعلقات ہیں، اور پھر اس طرح تو کھانا کھانا بھی ناپاک عمل سمجھا جانا چاہیے۔''

''محبت کے بارے میں فواد کا لیکچر! اسے کہتے ہیں ایکسپرٹ کی اوپینیئن۔'' سرمد نے کہا۔

''بات سمپل سی ہے۔'' فواد نے بات جاری رکھی۔'' ایک ماورائی محبت کرتے رہنے سے آپ کی تسلی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ کا محبوب آپ کو چاہے نہ چاہے، بلکہ یہاں تک کہ جانے نہ جانے اور جب کہ محبت ایسا ہی ایکسٹرا فزیکل افیئر (extra physical affair) ہے تو آپ اپنے محبوب سے ملیں نہ ملیں، بس محبت کرتے رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ آپ کو

ایک بے چینی لگی رہتی ہے۔ پہلے دیکھنے کی بے چینی، دیکھ لیں تو بات کرنے کی اور بات ہو جائے تو کرتے رہنے کی۔ پھر چھونے کی اور چھوتے چلے جانے کی باری آتی ہے۔ بوس و کنار کا مرحلہ آتا ہے لیکن تسلی نہیں ہوتی۔ بے چینی، بے قراری جسے اس وقت انجانی خلش کہہ کر محبت کی معراج سمجھا جا رہا ہوتا ہے، ہر قدم پہ پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک جگہ پر بات بہت دیر تک رکی رہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ رکی ہوئی بات، شعر و ادب کو بہت خوبصورت تحفے بھی دے جائے لیکن اگر حالات سازگار رہتے ہیں تو بات بہر حال آگے بڑھتی ہے اور آخر کار کوئیٹس (coitus) تک جا پہنچتی ہے اور انسان کی ہر بے قراری، بے چینی کو تبھی قرار آتا ہے جب وہ کلائیمیکس (climax) کے نقطے سے گزر جاتا ہے۔''

میں مسلسل رتل کی گردن کے تل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

 

ایک اور شام

میں شیشے کے دروازے سے دیکھ رہا تھا۔ کلینک کے باہر ایک موٹر سائیکل آ کر رکی اور ایک خوش پوش آدمی جو چہرے مہرے سے آسان زندگی کا عادی معلوم ہوتا تھا میرے کیبن میں داخل ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب، ایک مریض دیکھنے جانا ہے۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے سنجیدگی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔ سلام علیکم جی۔۔۔''

جس خود اعتمادی اور کسی قدر نخوت کے ساتھ وہ کلینک میں آیا تھا، اسکی دیوار میں دراڑ پڑ گئی تھی۔

مریضوں کے قحط کے اس زمانے میں اپنی انا کو راضی رکھنے کے کے لئے میں ایسے ٹوٹکے کرتا رہتا تھا اور خود کو یہ باور کرانے کی کوشش میں بھی لگا رہتا تھا کہ جیسے فقط سنت کی پیروی کی خاطر ایسا کرتا ہوں۔

''جی فرمایئے، کہاں جانا ہے؟'' میں نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

مجھے پتا تھا کہ اب غیر شعوری طور پہ میں اپنے اس ''وعلیکم السلام'' کی تلافی شروع کر دوں گا۔۔۔ زیادہ متواضع ہو کر، یا شاید اس چکر میں اپنی وزٹ فیس ہی چھوڑ دوں۔ میں کبھی نہ جان سکا کہ مجھے لوگوں کی خود اعتمادی پہ ضرب لگا کر زیادہ خوشی ہوتی ہے یا اپنی ہی لگائی ہوئی چوٹ کے نتیجے میں ان کے رویے میں آنے والی اچانک تبدیلی کو دیکھ کر دکھ زیادہ ہوتا ہے۔

''فاروقی روڈ پہ جی۔ شمالی محلّہ ہے۔ میں آپ کو زحمت نہ دیتا لیکن اماں جی کو لانا ممکن نہیں ہے۔ انکا سانس بہت خراب ہو رہا ہے اور بخار بھی بہت تیز ہے۔''

''کوئی بات نہیں جناب، ہم چلے چلتے ہیں۔ بائیک ہے نا آپ کے پاس؟''

''جی میں لایا ہوں۔''

میں نے تھرمومیٹر، سٹیتھوسکوپ اور بی پی اپریٹس ایک بیگ میں ڈالے اور حنیف کو ہدایات دیتا ہوا کلینک سے نکل آیا۔ میرے پڑوس میں جتنے ڈاکٹر بیٹھتے تھے، ان میں سے کوئی بھی کلینک سے باہر مریض دیکھنے نہیں جاتا تھا۔ انہیں اس کی ضرورت تھی، نہ فرصت۔ لیکن اپنے مریضوں کی محدود، بہت محدود تعداد کے پیشِ نظر میں یہ عیاشی نہیں کر سکتا تھا۔

راستے میں ظفر صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی والدہ اصل میں کوئی بزرگ وغیرہ ہیں۔یعنی اللہ والی بی بی۔ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔پیشن گوئیاں پوری ہوتی ہیں۔لوگ ان کے پاس دم کروانے آتے ہیں اوران کے بے شمار مرید ہیں۔

ظفر صاحب کا گھر اندرون شہر کے عام گھروں جیسا ہی ایک گھر تھا جن کے ظاہر سے ان کی اصلی حالت، سازوسامان، گنجائش اورمکینوں کے معاشی حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔لکڑی کے دو پرانے مگر مضبوط، ادھ کھلے کواڑوں کے آگے برآمدے میں لٹکے ہوئے میلے سفید پردے کے فوراً بعد منظر بدل گیا۔مکمل چپس شدہ، انتہائی صاف ستھرا فرش برآمدے سے صحن میں اور صحن سے اندر کمروں میں گھستا چلا گیا تھا۔صدر دروازے کو چھوڑ کر باقی سب ایک پٹ کے جدید لاکس (locks) والے دروازے تھے۔دیواروں پہ نفیس پینٹ تھا اور جگہ جگہ خوبصورت مناظر کے فریم سجے تھے۔ میں نے ظفر صاحب کی رہنمائی میں مریضہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے باورچیخانے میں چھ فٹ کے غیر ملکی فریج اور کوکنگ رینج کی ایک جھلک دیکھی اور دل ہی دل میں اپنی وزٹ فیس جسے میں راستے کی گفت وشنید کے دوران پیدا ہو جانے والے ایک ہلکے سے تعلق کے نتیجے میں ہزار سے پانچ سو پہ لا چکا تھا، دوبارا ہزار روپے مقرر کردی۔

مریضہ کے کمرے میں گیس کا ہیٹر جل رہا تھا۔کھڑکیوں پہ بھاری پردے تھےاور کمرے میں تیمارداروں کا ہجوم تھا۔زیادہ تر عورتیں تھیں۔کچھ گھر کی ہونگی اور کچھ پڑوسنیں۔اورسب کی سب یقیناً ارادتمند بھی۔کمرے میں حبس تھا، اور فضاء میں ایک عجیب سی باس تھی۔

محلے کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔یہ شاید تازہ بنی ہوئی چائے کی خوشبو سے مشابہ ہوتی ہے، جب اسے پیالیوں میں انڈیلا جارہا ہو۔یا پھر دم پر رکھے ہوئے چاولوں کی بو جیسی۔یا شاید صحن میں تار پہ لٹکتے، دھوپ میں سوکھتے کپڑوں کی مہک جیسی۔بلکہ شاید ایک ساتھ ان سب جیسی۔اندرون شہر کے گنجان محلوں میں گھٹن کا ایک احساس رچا بسا ہوتا ہے۔شاید ہوا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی اوکسائیڈ کے بگڑے ہوئے تناسب کی وجہ سے۔

محلے کی مشترک چیزوں میں جہاں محلّہ کمیٹی کے دفتر میں چندے سے خریدے گئے تنبو قناتیں اور گلاس پلیٹیں ہوتی ہیں جو اہل محلّہ خوشی غمی کے موقعوں پہ بلامعاوضہ استعمال کرتے ہیں، وہیں ایک آدھ ایسی شخصیت بھی ہوتی ہے جو بچھو کے کاٹے کے دم سے لے کر عورتوں کے لئے ان کے مردوں کے التفات اور آمدنی میں اضافے کے تعویذ بھی دیتی ہیں۔اماں جی شاید ایسی ہی شخصیت تھیں۔

’’پلیز ایک دو متعلقہ لوگوں کے سوا مریض کے پاس کوئی نہ ٹھرے۔باقی لوگ باہر چلے جائیں۔‘‘

میں نے بلند آواز سے کہا۔اس کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔یعنی کمرے میں خاموشی چھا گئی اور ہر شخص اپنے آپ کو متعلقہ سمجھتے ہوئے اپنی جگہ پہ موجود رہا۔میں نے ظفر صاحب کی طرف دیکھا۔ان کی شخصیت تبدیل ہوگئی تھی۔خوش باش اور لاپروا انداز کی جگہ اب خوف اور ادب نے لے لی تھی۔انہوں نے ایک بوڑھی عورت کے قریب جا کر آہستہ آہستہ کچھ کہنا شروع کیا۔

’’خالہ جی، ڈاکٹر صاحب کہندے نیں۔۔۔‘‘لیکن وہ اپنی بات مکمل نہ کرسکے۔

''کلثوم پتر، توں ایدر آجا میرے کول، ظفری توں وی اندر ای ٹھہر۔ باقی سارے بندے ہن جاؤ، اللہ بیلی۔''

یہ اماں جی کی گونجدار آواز تھی۔ کمرہ ایک منٹ میں خالی ہو گیا۔ صرف دو عورتیں رہ گئیں اور ظفر صاحب۔۔۔اور میں۔

اماں جی اندازاً پچپن ساٹھ برس کی ایک نہائت گوری چٹی اور فربہ اندام خاتون تھیں۔ چہرہ شاید بخار کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ دہانے کی بناوٹ سے سخت گیری عیاں تھی اور آنکھیں غمگین ہونے کی حد تک سنجیدہ۔ نقوش کی دلآویزی موٹاپے میں پوری طرح دفن نہیں ہوئی تھی۔ بال حیرت انگیز طور پہ سیاہ اور چمکدار تھے۔ بظاہر رنگے ہوئے نہیں لگتے تھے۔ دوسری خاتون بس ایسی تھیں کہ جیسے اماں جی میں سے تیس سال اور تیس کلوگرام نکال دیے گئے ہوں۔

اماں جی کے سانس کی رفتار خاصی تیز تھی اور ویزنگ (wheezing) صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اس کرسی پہ بیٹھ گیا جو میرے ہی لئے ان کے بستر کے پاس لا کر رکھی گئی تھی۔

''سلام علیکم اماں جی۔''

''وعلیکم سلام ڈاکٹر صاحب، جی آیاں نوں۔''

''ہاں، اب مجھے تفصیل سے بتائیں ہوا کیا؟''

میں نے اپنے آلات بستر پر ان کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر جی مجھے کچھ بھی نہیں ہوا، بس یہ بچے خوامخواہ پریشان ہو گئے۔''

''ٹھیک۔'' میرے تجربے میں ایسے مریض کم ہی آئے تھے جو کلینیکل ہسٹری میں معاون ثابت ہوئے ہوں۔

''ظفر صاحب کسی ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کر، پٹ تھوڑا سا کھول دیں۔ اور ہاں، اس ہیٹر کے سامنے کھلے منہ کے کسی برتن میں کچھ پانی رکھوا دیں، اور اس میں ایک چمچہ وکس کا ڈال دیں۔''

ظفر صاحب کھڑکی کھولنے لگے اور کلثوم شاید پانی لانے کے لئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

''اماں جی، یہ سانس کی خرابی کب سے ہے آپ کو؟''

''سانس تو ڈاکٹر جی جب سے آرہا ہے، بس خراب ہی کر رہا ہے۔''

''کھانسی بھی ہے؟'' میں نے ان کے فلسفیانہ جواب کو نظرانداز کر کے پوچھا۔

''بہت معمولی سی۔''

''اور بخار۔۔؟ یہ کب سے ہے؟''

''دو تین دن سے ہے۔ کبھی تیز کبھی ہلکا۔ لیکن ڈاکٹر جی اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ چیک کر کے دیکھ لیں۔''

میں نے ان کی نبض دیکھی۔ ہاتھ تو تپ رہا تھا لیکن نبض کی رفتار ٹھیک تھی۔ اب ویزنگ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اماں جی کے منہ میں تھرمومیٹر رکھ کر میں نے بلڈ پریشر لینا شروع کیا۔ پھر سٹیتھوسکوپ سے سینہ آسکلٹیٹ (auscultate) کیا۔ پھیپھڑے بالکل صاف تھے۔ کوئی رونکس (ronchus)، نہ کوئی کریپی ٹیشن (crepitation)۔ تھرمومیٹر نکال کر دیکھا۔ پارا اٹھانوے پہ تھا۔ یعنی بالکل نارمل۔ 'بڑھیا فنکشنل ہے شاید' میں نے کچھ ضروری سوال پوچھے اور معائنہ مکمل کیا۔

''اس وقت تو آپ واقعی بالکل ٹھیک ہیں۔'' میں نے انہیں بتایا۔ ''نبض ٹھیک، بی پی ٹھیک، بخار نارمل، سینہ صاف۔ لیکن یہ ہے حیرت انگیز بات۔ میں جب آیا تھا تو آپ کافی بیمار لگ رہی تھیں۔''

اور میں واقعی کچھ حیران تھا۔ میں نے ان کے بارے میں پہلا تاثر یہی لیا تھا کہ سینے کی کوئی انفیکشن ہے جس نے رطوبتوں کے ساتھ سانس کے راستے تنگ کر دیے ہیں اور میرا پہلا تاثر۔۔۔ اگر میں کوئی پہلا تاثر لوں تو۔۔۔ کم ہی غلط ہوتا ہے۔ مریض اگر بن بھی رہا ہو تو اس کا اندازہ لگانے میں بھی ڈاکٹر کو زیادہ مشکل پیش نہیں آتی ہے۔ اور وہ ویزنگ، سانس کے ساتھ سیٹی کی سی آواز تو بالکل اصلی تھی۔

''کوئی حیرت انگیز نئیں ڈاکٹر جی، میں دسنی آں۔ تسی بیٹھو، تشریف رکھو۔'' اماں جی نے کہا۔ ''ظفری، ڈاکٹر صاحب دے لئی چاء وغیرہ دا بندوبست کر۔''

''نہیں اماں جی، پلیز۔ میں چائے وائے نہیں پیوں گا۔ مجھے بس اجازت دے دیں۔'' حقیقتاً مجھے کسی کے گھر کھانے پینے سے بہت الجھن ہوتی تھی، اور میں جلد از جلد واپس کلینک پہ بھی پہنچنا چاہتا تھا۔

''بیٹھ جاؤ ڈاکٹر جی، کسے دی دعوت نئیں موڑنی چاہی دی۔ سرکار کملی آلے دا طریقہ سی۔ کسے دی دعوت نئیں سن کدے موڑ دے۔'' اماں جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''جی بہتر۔'' میرے پاس اب کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔

''بات صرف اتنی ہے ڈاکٹر جی کہ میں بیمار تھی، سانس میرا خراب تھا، بخار مجھے بڑا تیز تھا۔ جیسے ہی آپ نے میری نبض پکڑی ہے۔۔۔ میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔''

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر الفاظ نہ پا کر بند کر لیا۔

''ڈاکٹر جی، آپ اس بات کو شاید ابھی سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن میرے مولا نے تہانوں عطا کیتی اے۔ نعمت دتی اے۔ نہ، نہ۔ حیران پریشان ہون دی لوڑ نئیں۔ سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے اس بات کو۔ بس جان لیں اور مان لیں۔ ہر بات بندہ سمجھ وی نئیں سکدا۔ آپ کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے پتا لگ گیا تھا۔ حالاں، نبض تکن لئی تسی اتنی توجہ نال، اتنے پیار نال میرا ہتھ نئیں پکڑیا جتنے دھیان نال میرا خاوند اور بچے، تہاڈے آن توں پہلاں مینوں ٹوہندے، گھٹدے رئے نے۔ فیر ضیاء وی آیا ہویا اے پنڈی توں خاص میرے لئی۔ تے او

تے میرا رنگ مجازا اے۔اوس نے تے چھی پائی اے مینوں خالص محبت دے نال، پیار کیتا اے میرے متھے اتے ،لیکن کجھ نئیں ہویا۔میری طبیعت نوں ذرا فرق نئیں پیا۔کیوں؟ ایس لئی کہ اوہناں کول جذبہ اے،عقیدت اے،محبت اے پر اوہ چیز نئیں جیہڑی تہاڈے کول اے۔''

''تے میرے کول۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے اس طرح تو میرے سارے مریضوں کو ٹھیک ہو جانا چاہئے ،بغیر کسی دوا کے،صرف ہاتھ لگانے سے۔''

حالانکہ میں چائے والی بات مانتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جو گفتگو ہوگی اسے چپ چاپ سنوں گا اور کوئی سوال نہیں کروں گا تا کہ بات جلد از جلد ختم ہو جائے۔لیکن انہوں نے بات ہی ایسی کی کہ میں خاموش نہ رہ سکا۔

''نہیں ڈاکٹر جی نہیں۔سارے مریض نہیں۔ایسے علاج کے لئے مریض بھی کوئی کوئی ہوتا ہے،مرض بھی خاص ہوتے ہیں۔اس گل نوں چھڈ دیو ڈاکٹر صاحب،تسی نئیں سمجھ سکدے۔''

میں کچھ نہ بولا۔مجھے پتا نہیں کیوں بابا نمازی یاد آ رہا تھا۔اس مسجد کا خادم جس میں میں نے اپنے بچپن کی بیشتر نمازیں پڑھی تھیں۔نام تو کوئی اس کا جانتا نہیں تھا،سب بابا نمازی ہی کہتے تھے۔بابا نمازی کا قد قدرے لمبا اور جسامت درمیانی سی تھی۔عمر پچاس سے ستر کچھ بھی ہوسکتی تھی۔کیوں کہ بال تو مستقل صافے میں ڈھکے رہتے تھے اور چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔اس کی جلد عجیب سی تھی۔چکنی،چمکدار،بغیر بال کے۔پانی اس کے ہاتھوں پیروں پر بالکل نہیں ٹھہرتا تھا اور وہ وضو کر کے بھی خشک کا خشک رہتا تھا۔جب وہ اپنے چمکتے ہوئے جامنی پیروں کے ساتھ جن پہ کہیں کہیں پانی کے قطرے لرز رہے ہوتے ،ہولے ہولے چلتا ہوا صف میں آ کر کھڑا ہوتا تو اکثر میرا دل چاہتا کہ اس کے وضو کے لئے کسی بالٹی میں پانی ہونا چاہئے جس میں ڈبو ڈبو کر وہ اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے۔اس خواہش کے سرے سے یہ خوف بھی بندھا ہوتا کہ پانی کی بالٹی سے بھی اس کے ہاتھ پاؤں سوکھے ہوئے ہی نکلیں گے۔بابا نمازی سلوموشن آدمی تھا۔سست روی سے وضو کرتا،آہستہ آہستہ چلتا۔مسجد میں جھاڑو دیتا تو گھنٹوں لگا دیتا۔اذان دینے کے لئے کھڑا ہوتا تو لاؤڈ سپیکر درست کرنے میں ایسا منہمک ہو جاتا کہ جیسے اذان دینا ہی بھول گیا ہو۔ہر وقت منہ ہی منہ میں کوئی وظیفہ پڑھتا رہتا جس کی بڑ بڑاہٹ پوری مسجد میں سنائی دیتی رہتی تھی۔ شاید ہی کبھی کسی نے اسے کچھ کہتے بولتے سنا ہو۔نمازی لڑکوں کی ٹولی میں کچھ اذان دینے کے بہت شائق تھے۔میں بھی ان میں سے ایک تھا۔لیکن ہم سب بابا نمازی سے اذان کہنے کی اجازت لیتے میں جھجھکتے تھے۔مجھ پر اس کی خاص مہربانی تھی کہ جب کبھی وقت پر پہنچ جاتا،از خود لاؤڈ سپیکر کی طرف اشارا کر دیتا تھا کہ اذان کہوں۔

میں نے نسخہ لکھنے کے لئے کاغذ قلم مانگا جو فوراً کسی بچے کے بستے سے نکال کر مہیا کر دیا گیا۔

''اماں جی،فی الوقت تو میری سمجھ میں ایسی کوئی دوا نہیں آ رہی ہے جس کی آپ کو ضرورت ہو۔بہر حال یہ پیراسیٹامول کی گولیاں لکھ رہا ہوں۔اگر اب بخار ہو تو دو گولیاں پانی کے ساتھ لے لیں اور ساتھ ہی ساتھ۔۔''میں نے کلثوم کی طرف دیکھا''۔۔بخار چیک کر

کے نوٹ کرلیں کہ کتنا ہے۔ یہ ایک کھانسی کا سیرپ ہے، کھانسی اٹھے تو دو چمچ پی لیں۔اس کے علاوہ ایک آدھ وقت کے کھانے میں نرم غذا لے لیں۔رہ گیا آرام۔تو وہ تو آپ کر ہی رہی ہیں۔''

''آرام کہاں ڈاکٹر صاحب۔عشاء کے بعد سے جو نفلیں اور وظائف۔۔۔۔''

اماں جی نے نظر بھر کے دیکھا اور کلثوم کی بات ادھوری رہ گئی۔

''بہر حال اگر ایک دو دن نفلوں وغیرہ کا ناغہ کرلیں تو بہتر ہے۔''میں نے اماں جی سے کہا۔

''ناغہ تے ڈاکٹر جی نئیں ہوسکدا۔''

''کیوں نئیں ہوسکدا۔کوئی فرض نماز تے ہے نئیں۔''

''تسی ٹھیک کہندے او۔ایہہ میری گل سمجھو۔ویکھو نا، روٹی ضروری اے بندے لئی ٹیم تے کھانی، زندہ رہن واسطے۔پر جس نوں ٹی بی ہوجائے، تسی ڈاکٹر لوک ای دوائی دا ناغہ نئیں کرن دیندے۔اک دن دا وی۔اک ٹیم دا وی۔آکھدے او کورس پورا کرو۔ساڈا وی کورس اے ڈاکٹر جی۔رات دا وقت بیماراں دا ہوندا اے۔علاج واسطے۔پہلا ٹیم اک توں دو عارفاں، قلندراں تے شہیداں دا، دوجا ٹیم دو توں تن صوفیاں تے مستاں دا۔۔۔''

''تسی کون او، عارف، قلندر، صوفی؟''

''میں تے اینہاں دے پیراں دی مٹی وی نئیں۔میری کیہہ اوقات؟ میں تے ڈاکٹر صاحب بس انج ای ٹکراں مارنی آں ہر بوہے تے، جیہڑا وی کھل گیا۔رب کرے کوئی کھل جائے۔''

چائے اپنے غیر ضروری لوازمات کے ساتھ آپہنچی تھی۔

''تو پھر کتنا سفر طے ہو گیا آپ کا؟''میں نے اپنی پیالی بناتے ہوئے صرف کچھ کہنے کے لئے کہا۔

''اک سفر تے مک چلیا اے تے دوجا ہالے شروع وی نئیں ہویا۔''اماں جی نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔''میری تے اجے اپنے نفس دے نال یاری ہوئی اے۔''

''نفس نال یاری؟''میں نے دہرایا۔

''ہاں جی! ایہہ دوستی بڑی اوکھی ہوئی اے۔بڑا وحشی سی پہلاں پہلاں تے۔ضدی تے اتھرا۔ہر وقت کسے خواہش دے مغر، ہر وقت کوئی نہ کوئی مطالبہ۔سخت دشمن سی میرا۔بڑی مشکل منایا اے۔ہن تے سنگی اے میرا۔بیبا تے سونہڑا۔بالکل تیرے جیہا ڈاکٹر۔میں تے آپ جے ویکھیا اے۔اچا، لم سلما، گورا چٹا، سونہڑا۔میری مرضی دے نال نال چلدا اے ہن تے۔''

''یہ دوستی ہوئی کس طرح؟''میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''بس ایہدی ریت وی بڑی عجیب اے۔آسان گل اس طراں سمجھ لئو کہ آپ اس کی مانتے رہیں گے تو یہ آپ کی نہیں مانے گا۔ اور اگر اس کی بات نہیں مانیں گے تو یہ تابعدار ہو جائے گا۔''اماں جی شاید میری آسانی کے لئے کہیں کہیں اردو میں بات کرتی تھیں۔خاص طور پہ وہ بات جسے زیادہ اہم سمجھتی تھیں۔

''یہ نفس ہے کیا؟ کوئی ہمزاد وغیرہ؟''

''ستارا ہزار (۱۷۰۰۰) جون دی مخلوق سی زمین اتے جس ویلے انسان نوں خلیفہ بنان دا فیصلہ کیتا گیا۔چار فرشتے تے خالی مڑ گئے۔زمین نے انکار کر دتا۔مٹھ مٹی دی نئیں دتی۔وئی مینوں میرے توں جدا نہ کرو۔فیر رب نے عزرائیل نوں بھیجیا۔ایہہ بڑا اڈا اے۔ ایہدا اتے کم ای جدائیاں پانا اے۔ذرا نئیں جھکدا۔آیا۔مٹھ بھری تے لے گیا۔اوسے خاک نال آدم دا بت بنایا گیا جس دے وچ ستارا ہزار جوناں دا خمیر سی۔ڈاکٹر جی اے ای ستارا ہزار نفس نیں۔کوئی کتا اے،کوئی بلی۔کوئی سپ تے کوئی رچھ،کوئی ٹھوآں،کوئی بھگیاڑ۔ ساریاں توں پہلاں تے اپنے نفس نوں پچھاننا پیندا اے۔دوستی کرن دی سب توں پہلی شرط۔تے اے ای سب توں اوکھا کم اے۔ اک واری پچھان ہو جاوے تے فیر رام وی ہو جاندا اے۔پتا تے لگے کہ تہاڈا نفس ہے کیہڑا۔بس فیر آسان جیہا فارمولا اے۔جتنی اس نال دشمنی کرو گے اتنا ای تہاڈا دوست بنے گا۔بس تسی ایہنوں او شے نئیں دینی جو ایہہ منگے۔اچھی خوراک منگے،نہ دیو،نیند منگے،نہ دیو، آرام منگے،لذت،شہوت،جیہڑی وی شے منگے،نہ دیو۔۔۔''

''۔۔۔اور وہ جو قرآن پاک میں ہے؟ اللہ نے فرمایا ہے کہ میری عطا کردہ نعمتوں میں سے کھاؤ پیو۔تو پھر یہ نہ کھانا پینا،فاقے کرنا تو ناشکری نہ ہوئی۔۔''

''ڈاکٹر جی،آپ ٹھیک کہتے ہیں۔بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔پر دیکھو نا،ناشکری کیا ہوتی ہے؟ نعمت کھاؤ تے گل نہ منو۔کیوں،میں ٹھیک کہہ رئی آں نا؟ یعنی تنخواہ لیں اور کام نہ کریں۔تے فیر ناشکری دے وی درجے ہوندے نے۔اک درجہ تے ایہہ ہویا کہ بندہ تنخواہ اور کام دونوں میں ڈنڈی مارے،دوسرا درجہ یہ کہ تنخواہ تو لے پوری اور کام ایک نہ کرے۔اور پھر ڈاکٹر جی سب سے بری نافرمانی،انتہا درجے کی ناشکری یہ ہے کہ مالک کی دی ہوئی نعمتوں کو،اس کی عطا کی ہوئی طاقت کو اسی کے خلاف،اس دے حکماں دے خلاف استعمال کیتا جاوے۔ایہہ ناشکری دا سب توں ارذل درجہ اے۔جے ساڈے نفس نے کھا پی کے ڈکار مارنی اے تے لذتاں شہوتاں وچ پے جانا اے، گناہ کرنے نے،حکم تروڑنے نے تے فیر کیہہ لوڑ اے اس نوں کھلا پلا کے موٹا کرن دی۔بھکا رکھو مر جانے نوں۔۔۔''

''اچھا تو نفس آپ کا دوست بن گیا،پھر؟''

اگر اماں جی کو میری یہ مداخلت پسند نہیں بھی آئی تو انہوں نے اس اظہار نہیں کیا۔

''پھر کیا؟ فیر سمجھو ایہہ ای بیلی اے جیہڑا تہانوں محبوب دی محفل وچ وی لے جاندا اے تے مالک دے دربار وچ وی۔''

''پر تسی تے کہندے او، دروازے ای بند ملدے نے۔'' میں نے چھیڑا۔

''دروازے بند ای سہی ڈاکٹر، پر ہین تے اوسے دربار دے۔'' اماں جی نے پھر ایک بار آنکھیں پونچھیں۔ ''فیر اک ہور وی پاسپورٹ چاہیدا اے باریابی دے واسطے۔''

''وہ کونسا؟''

''عشق دا۔''

''عشق؟''

''ایہہ ای تے اصل چیز اے ڈاکٹر جی، عشق ای تے اودھن اے، اولگن اے جو ساریاں منزلاں پار کرا دیندا اے۔ ڈاکٹر جی عشق ایک ایٹمی توانائی ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی۔ یہ کسی بھی رنگ میں ہو چل جاتا ہے۔ مجازی وی ہووے تے اس بارگاہ دے وچ قبول ہو سکدا اے۔ لیکن ہوس کوئی وی ہووے نامقبول اے، تے ناپسندیدہ۔ لیکن میرے سوہنڑے ڈاکٹر جی، اینہاں ضداں دے درمیان فرق وی بڑا عجیب تے نازک اے۔ جے نفس قابو وچ ہووے تے سفر عشق دا اے تے جے تسی آپ نفس دے قابو وچ ہوو تے سمجھ لئو کہ پینڈا ہوس دا اے۔ اگر نفس سوار ہو جاوے تے اپنی سواری نوں رجیم بنا دیندا اے تے جے نفس آپ سواری ہووے تے براق بن جاندا اے۔''

اماں جی کی گفتگو دلچسپ تھی لیکن مجھے اب واپس پہنچنے کی فکر ہو رہی تھی۔ میں نے اختتامیے کے لئے سرسری سے انداز میں کہا۔

''اللہ ہمیں اپنا عشق عطا کرے۔''

''دھیان کریں ڈاکٹر!'' اماں جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کوئی کوئی قبولیت دا لاٹیم ہوندا اے۔''

''تو یہ تو اچھی بات ہے اگر یہ دعا قبول ہو جائے۔''

''اچھی بات تے ہے پر عاشقاں دے امتحان وی ہوندے نے۔ تے اللہ بڑا غیرت مند اے۔ ساریاں توں زیادہ غیور۔ اوہ فیر ہور نئیں کج رہن دیندا۔ دل وچ اک واری آ جائے تے فیر اپنے نال کسے ہور نوں نئیں رہن دیندا۔''

واپسی کے سفر میں، موٹر سائیکل پہ ظفر صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں نہ عشق کا نعرہ گونج رہا تھا اور نہ ہوس یا نفس کی کچھ تکرار تھی۔ اپنی جیکٹ کے کالر کانوں تک کھینچ کر سرد ہوا اور بے ہنگم ٹریفک کے دھوئیں اور دھول سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ 'رنگ مجاز' کیا چیز ہے۔

 

پھر ایک اور شام

نذیر دیوانہ کلینک کے دروازے کے قریب اپنی بغیر سٹینڈ والی سائیکل کلینک کے قدمچے اور دیوار کے سہارے اس طرح سے کھڑی کر رہے تھے کہ گلی کا راستہ بھی کم نہ ہو اور میرے کیبن میں بیٹھے ہوئے وہ سائیکل کے کیریئر کا کچھ حصہ بھی نظر میں رکھ سکیں۔ اگر چہ ان کی اس قسم کی احتیاطیں ان کی پچھلی سائیکل کو چوری ہونے سے نہیں بچا سکی تھیں لیکن ان کا کہنا تھا کہ "تدبیر کند بندہ تو تقدیر زند خندہ۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ بندہ تدبیر اپنی طرف سے پوری کرے اور پھر بات تقدیر پہ چھوڑ دے۔" وہ اکثر اشعار اور ضرب الامثال کی تشریح اسی طور کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر شعر بہت یاد تھے اور ان کے پڑھنے میں وزن یا موقع کو کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے۔ اپنی اسی صلاحیت کے باعث وہ خود ذاتی طور پہ شاعری نہ کر سکنے کے باوجود دیوانہ تخلص رکھتے تھے اور اپنے متصرف شعروں میں سے اکثر کے ساتھ چپکا بھی لیتے تھے۔

میرے کلینک میں آنے والے مریضوں کی محدود سی تعداد میں بھی ایک اچھی خاصی ورائیٹی تھی۔ یہ سبھی اکتا دینے والے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ کچھ تو بڑے دلچسپ لوگ تھے۔ مثلاً شوکت چوہدری جو اپنے اخراجات کا تعین کر چکے تھے اور اب صرف ان کے مطابق آمدنی کی فکر میں تھے۔ راؤ عزیز آدھی رات اور سارا دن کی نیند کے بعد سہ پہر ہوتے ہی نہا دھو کر کلف لگے کپڑے پہنے آ جاتے اور اپنے اس کاروبار کی باتیں شروع کر دیتے جسے انہوں نے بڑی محنت سے برباد کیا تھا۔ پھر صوبیدار حشمت صاحب تھے جنہوں نے فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ٹیچری کی اور اب محکمہء تعلیم سے بھی ریٹائر ہونے کے بعد ٹی وی ریڈیو ٹھیک کرتے تھے۔ ایسے اور بھی کچھ لوگ تھے اور انہی میں ایک نذیر دیوانہ تھے۔ ان سے ملنا میرے لئے ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ ان کا کوئی مستقل تکیہ کلام نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی مخصوص اور بہت دلچسپ تراکیب لفظی استعمال کرتے تھے۔ نہ ان کی گفتگو میں ایسی کوئی حماقت کی یا غیر معمولی سمجھ کی بات ہوتی کہ جس کا ذکر کر کے ان سے ملاقات کے مزے کی وضاحت کی جا سکے۔

اپنی شکل صورت اور حلیے سے وہ بالکل ایسے خوش طبع اور بے تکلف آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے جیسے کہ حقیقت میں وہ تھے۔ قد متوسط لیکن تن و توش میں کچھ دبا ہوا سا، رنگ سیاہ، بال چھوٹے چھوٹے، کھوپڑی کے ساتھ چمٹے ہوئے گھنگھریالے، ماتھا چوڑا اور آنکھوں کے اوپر سے ابھرا ہوا۔ آنکھیں چہرے کے اعتبار سے کچھ چھوٹی تھیں۔ ناک پھیلاؤ رکھنے کے باوجود بیٹھی ہوئی نہیں تھی۔ چہرہ مجموعی طور پہ ایک مضبوط خدوخال کا کرخت چہرہ تھا۔ ہاتھ بڑے بڑے اور کھردرے۔ یعنی نذیر دیوانہ کو دیکھنے سے ایک سخت گیر اور خشک مزاج آدمی کا تاثر ملتا تھا، جو ان کے بولتے ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔

یہ ان کا ہوشیار پور سے لایا ہوا لہجہ تھا جس کا پرتو ان کی ساری شخصیت کا تاثر ہی بدل کر رکھ دیتا تھا یا پھر گفتگو کے دوران آواز کا زیر و بم تھا، اور وہ ہاتھوں کی حرکت، جیسے دو (۲) کہتے ہوئے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو، دو بہت موٹی موٹی انگلیوں کو آگے پیچھے ہلانا۔ یا شاید اصل چیز وہ تاثرات تھے جو نذیر دیوانہ کسی کی بات سنتے ہوئے اپنے چہرے پر طاری کر لیتے تھے جیسے صرف اس لئے توجہ دے رہے ہوں کہ بات ختم ہوتے ہی مناسب جگت لگا سکیں۔ اور پھر وہ ہلکی سی ہنسی تھی جو وہ خود بات کرتے ہوئے ہنستے تھے جیسے مخاطب کا تمسخر اڑا رہے ہوں۔ پھر ان کے ایمبیسی سگریٹ تھے جنہیں وہ شہادت اور درمیان کی انگلی کے درمیان دبا کر مٹھی بند کر کے پیتے تھے۔ اس انداز میں جواب متروک ہوتا جا رہا ہے۔ یا پھر گفتگو کے سارے لطف کی چابی ان کی ادائیگی میں تھی۔ جیسے وہ 'بہت' کہتے ہوئے 'ہ' پر شد لگا دیتے تھے اور فقرے کے آخری لفظ کو اکثر تھوڑا سا لٹکا دیتے تھے جیسے 'جناب' کو کچھ 'جنابے' سا بنا دینا۔ باقی کی ساری باتیں تو بعد میں آتی تھیں، یعنی ان کی مردانہ اور غیر مردانہ طاقت کے قصے، ان کے پیر صاحب کے خصوصی عطیات، شوگر کے علاج کے لئے خود انہی کے بنائے ہوئے دیسی نسخے، مسروقہ گائے کی بازیابی کا تعویذ اور اس تعویذ کی تاثیر کے احوال۔ اور وہ من گھڑت رنگا رنگ حکائتیں جو ان کے منہ سے بیان ہونے تک تو بہت دلچسپ اور زوردار ہوتی تھیں لیکن سیکنڈ ہینڈ ہوتے ہی اپنا سارا مزہ کھو دیتی تھیں۔

نذیر دیوانہ یوں تو حامد باری کے چچا تھے لیکن میرا انکا تعارف اسکے حوالے سے نہیں تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ باری جیسے فواد کی دریافت تھا، نذیر دیوانہ ویسے ہی میری دریافت تھے۔ اچانک دریافت۔ ان دریافتوں کے قصے سادا سے ہیں۔ باری کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب ہم اس شہر میں منتقل ہوئے تو فواد نے اپنی جولانیء طبع سے مجبور ہو کر ایک کراٹے کلب کھول لیا تھا۔ یہاں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کلب تھا۔ پہلے تو لوگ دور ہی سے گنتی کے چند لڑکوں کو کالج گراؤنڈ میں ورزشیں اور جوڈو کراٹے کے کاتے کرتے دیکھ کر حیران اور محظوظ ہوتے رہے، پھر دھڑا دھڑ داخلے ہوئے۔ حامد باری فواد کے شروع کے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ کرکٹ کا اچھا کھلاڑی تھا لیکن کراٹے سیکھنے میں خاصا نالائق تھا۔ جس دن فواد کی ایک سائیڈ کک غلط طریقے سے روکنے کے نتیجے میں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی دوسری بار دوسری جگہ سے ٹوٹی، وہ اس کی ٹریننگ کا آخری دن تھا۔ اور فواد سے دوستی کا پہلا۔ فواد کا کہنا تھا کہ باری میں کراٹے وغیرہ سیکھنے کی صلاحیت تو نہیں تھی لیکن حوصلہ ضرور تھا۔ اور انگلی کا دو بار ٹوٹنا انہی دو چیزوں کی بالترتیب عدم موجودگی اور موجودگی کا ثبوت تھا۔ فواد کے ساتھ دوستی رکھنے کے لئے بھی اسی قسم کے حوصلے کی ضرورت تھی۔ دونوں کی خوب نبھی۔ باری کی دوستی میں چھوت کی بیماری کی سی بات تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے ہمارے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ امی اس کی ماں جی تھیں، ابو چاچا جی، کوکب سسٹر اور میں تو پہلے ہی سے علی بھائی تھا۔

نذیر دیوانہ کے ساتھ میری ملاقات کا واقعہ اس سے بھی سادا ہے۔ وہ میرے کلینک پر آئے تھے، کمر درد کے علاج کے لئے۔ یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ وہ علاج کی غرض سے کسی ڈاکٹر کے پاس آئے کیوں کہ اپنے تئیں حکمت میں بھی کم و بیش اسی قدر دخل رکھتے تھے جتنا کہ شاعری میں۔ ہوا یہ کہ جس کمر درد میں وہ ان دنوں مبتلا تھے، اس کے علاج کے لئے ان کی تجویز کردہ جڑی بوٹیوں کے سفوف

دستیاب نہ ہو سکے۔اس سلسلے میں کشمیر کا سفر وہ اپنی کاروباری مجبوریوں کی بناء پر نہیں کر سکتے تھے۔چنانچہ ہسپتال روڈ کی طرف جاتے ہوئے جو پہلا کلینک انہیں نظر آیا، اسی میں چلے آئے۔ یہ میرا کلینک تھا۔انہوں نے مجھے اپنی تکلیف کی نوعیت، اس کی وجہ، اپنی تشخیص اور مجوزہ علاج سے آگاہ کیا اور اس علاج کے حصول میں جو دشواری تھی وہ بھی بتائی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''میں نے قلم اور نسخے کا کاغذ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''نام نذیر دیوانہ ہے جناب''

''یعنی دیوانہ بھی؟''میں نے قلم روک کے پوچھا۔

''جی ہاں۔اور وہ اس لئے کہ شعروشاعری کا بھی شوق رکھتا ہوں۔''

وضاحت بالکل سادا تھی۔اور برجستہ بھی۔

''واقعی؟''میں قلم رکھ کر مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بہت۔''انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔''عرض کیا ہے، زیست مشکل ہے تو موت کا ساماں کر دے۔''پھر خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔میں نے مصرعہ دوہرایا تو انہوں نے دوبارا ٹھہر ٹھہر کر پڑھا۔''زیست مشکل ہے تو موت کا ساماں کر دے''اس کے بعد وہ دو تین سیکنڈ چپ چاپ میری طرف دیکھتے رہے جیسے اندازہ لگا رہے ہوں کہ میں دوسرا مصرعہ سننے کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تیزی سے دوسرا مصرعہ پڑھ کر شعر مکمل کیا۔

''صورتیں دو ہی ہیں، ایک تو آساں کر دے''

شعر نجانے کس کا تھا۔اس میں کوئی دم بھی تھا یا نہیں، لیکن وہ جس داد طلب انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے اس کا بھرم رکھنے کو میں فوراً ہی 'واہ، بہت خوب' کہہ دیا۔

یہ تھی ہماری پہلی گفتگو۔اس کے بعد سے وہ ہفتہ دس دن میں کلینک کا ایک آدھ چکر لگا ہی لیتے تھے۔علاج کے لئے تو کم ہی کبھی آئے ہوں گے لیکن میرے لئے مریضوں کے انتظار کے ان طویل اور تھکا دینے والے دنوں میں ان سے ملاقات ہمیشہ بہت خوشگوار ہوتی تھی۔آج بھی میں نے کیبن کا دروازہ کھول کر ان کا استقبال کیا۔

''آیئے جناب نذیر دیوانہ صاحب، کیا حال ہیں؟''

''مالک کا فضل ہے۔ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا دو گھڑی ڈاکٹر صاحب سے گپ لگا لیں۔''

''ضرور ضرور''میں نے کرسی کی طرف اشارا کیا۔''بیٹھئے''

''کیسا کام چل رہا ہے؟''انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس گزارا ہورہا ہے۔''

''چلے گا، چلے گا، بہت کام چلے گا۔'' انہوں نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تسلی دی۔

''آپ سنائیں کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا

سمجھے تھے جس کو آسرا، وہ بھی بچھڑ کے رہ گیا''

''یہ تو کوئی فلمی گانا لگتا ہے!''

''زینت۔'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''سن انیس سو سنتالیس۔''

''انیس سو سینتالیس؟'' میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

''ہاں جی۔ انیس سن سنتالی میں ریلیز ہوئی تھی۔ بس اس کے فوراً بعد ہی پارٹیشن ہوگئی تھی۔''

''تو یہ شوق بھی رہا ہے آپ کو؟''

''بوہت۔'' انہوں نے مکمل سنجیدگی سے کہا۔ ''آج بھی مکیش کا گانا گاؤں تو بندہ چلتے چلتے رک جائے۔''

''کیوں؟'' میں نے مصنوعی سادگی سے پوچھا۔

''سننے کے لئے اور کیوں؟'' وہ میری طرف دیکھ کر ہنسے، جیسے میری بیوقوفی کا مذاق اڑا رہے ہوں کہ مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ چلتا بندہ گانا سن کر کیوں رک جاتا ہے۔

''شوگر کیسی ہے آپ کی؟''

نذیر دیوانہ ذیابطیس کے مریض تھے۔ اپنا ہی تیار کردہ نسخہ استعمال کرتے تھے۔ بد پرہیزی اور سگریٹ نوشی خوب کیا کرتے تھے۔ مہینوں شوگر چیک نہیں کرواتے تھے، اور اگر کبھی ٹیسٹ کرواتے بھی تھے تو خون میں شکر کی مقدار معلوم کرنے سے زیادہ اپنے نسخے کی کارکردگی جانچنا پیش نظر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ذیابطیس کے بیشتر مریضوں کی طرح وہ بھی اپنے ذاتی حس و ادراک کے میٹر پر انحصار کرتے تھے۔ ''شوگر ذرا بھی زیادہ ہو یا کم، مجھے خود پتا چل جاتا ہے۔'' اس دعوے میں وہ سچے ہوں نہ ہوں، مخلص ضرور تھے۔

''شوگر کو نہیں ملنے دیتا میں۔'' نذیر دیوانہ بولے۔ ''ابھی حامد کے گھر سے آم کا ملک شیک پی کے آرہا ہوں۔ بڑا گلاس۔'' انہوں نے ہاتھ سیدھا کر کے گلاس کی لمبائی کا اندازہ بتایا۔ ''اور دو گلاب جامن بھی کھائے ہیں۔ ہاں جی۔ اور اب چائے آپ پلائیں گے۔''

''ضرور، کیوں نہیں۔'' میں نے حنیف سے چائے کے لئے کہا۔

شوگر کے تقریباً سبھی مریض اپنی بد پرہیزی پر فخر کرتے ہیں۔ صرف اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے

سمیع انکل، سرمد کے والد، اس سلسلے میں قدرے شرمایا ہوا طرز اختیار کرتے تھے۔ یعنی انہیں خود اپنے معرکہ ہائے خوراک کی تفصیل بھی نہ بتانی پڑے اور آپ کو پتا بھی سب چل جائے۔ وہ عام طور پہ اپنی بیوی کی موجودگی میں شوگر کی شکایات کے بارے میں بات کرتے تھے۔

''یہ بیٹا پاؤں کی انگلیوں میں نمبنس (numbness) بڑھتی جا رہی ہے۔ اور انگوٹھے کا اگلا سرا تو سمجھو بالکل ہی سو گیا ہے۔'' وہ پاؤں کے سوئے ہوئے انگوٹھے کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتے ہوئے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھتے اور نچلا ہونٹ کچھ لٹکا کر سر کو ہلکے ہلکے نفی میں ہلاتے۔ یہ ان کی طرف سے اپنے سوئے ہوئے انگوٹھے کو جگانے کی بھرپور کوشش بھی ہوتی تھی اور اس کوشش میں ناکامی کا انتہائی اظہار بھی۔

''شوگر لیول کیا ہے؟'' میں پوچھتا۔

''معمولی سی زیادہ ہے۔'' وہ پھپھی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بظاہر بڑی بے نیازی سے جواب دیتے۔ پھپھی جان موقع ملتے ہی اپنا پارٹ شروع کر دیتیں۔

''جی ہاں'' وہ طنز سے کہتیں۔ ''معمولی زیادہ ہے۔ آج صبح کی ریڈنگ دو سو اڑسٹھ ہے۔ اور اوپر سے انہوں نے سیب کھائے ہیں۔''

''واہ بھئی بڑی بھاگوان ہو تم۔'' سمیع انکل مصنوعی غصے سے کہتے۔ ''دو تو ٹوٹل دانے تھے۔''

''ایک کلو میں وہی دو تلے تھے۔''

شوگر کے کچھ مریض اپنے علاج اور پرہیز کے بارے میں حد سے زیادہ محتاط بلکہ وہمی بھی ہوتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنی احتیاط پسندی اور سنجیدگی پر نازاں رہتے ہیں۔ جیسے ٹھیکیدار صاحب کھانے پینے کے سلسلے میں انتخاب اور مقدار کے بارے میں پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتے تھے۔

''چکوترہ کھا لیا کروں ڈاکٹر صاحب؟''

''دودھ کا ایک گلاس تو پی سکتا ہوں روز؟''

''۔۔۔ ہمارے گھر گلاس ذرا بڑے سائز کے ہیں۔''

شوگر کے مریضوں ہی پر کیا موقوف، خود پسندی کا عنصر تھوڑا کم تھوڑا زیادہ اللہ نے ہر انسان میں رکھا ہے۔ پھر اس کا اظہار جس قدر واضح ہوتا چلا جاتا ہے، وہ شخص اسی قدر ناپسندیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اظہار کے مختلف انداز ہیں۔ کوئی شخص اس کے لئے چھاتی پھلا کے چلتا ہے، آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہے اور معانقے کے دوران آپ کی پسلیاں کڑ کانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ کسی کے لہجے میں اپنی بیماری کا دورانیہ، بخار کا درجہ یا گردے سے نکلی ہوئی پتھری کا سائز بتاتے ہوئے فخر جھلکنے لگتا ہے۔ کوئی اپنی لاپروائی کو باعث ناز سمجھتا ہے۔ کہیں کہیں یہ خود پسندی حسرت آمیز گناہوں کے ذکر میں، 'خود لعنی طعنی' کے پردے میں چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ کسی کو اپنی مظلومیت، بھولپن اور مسکینی بہت اچھی لگتی ہے اور جہاں بندہ ہیرا پھیری سے، دوسروں کو کہنیوں سے دھکیل کر راستہ بنائے،

اپنے مفادات پر سمجھوتہ نہ کرے، اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹے، وہاں اسے اپنی چالاکی اور سفاکی، اپنی رتھ لیس نس (ruthlessness) بہت بھاتی ہے۔ جب زندگی میں موقعے ملتے رہتے ہیں اور بندے کی ذہانت قسمت کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے تو وہ اپنی دلیری اور ہوشیاری پر فریفتہ ہوتا ہے اور مواقع جس کے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہوں، جس کا پیچھے رہ جانا کسی کے آگے بڑھ جانے کا سبب بن جائے اور جسے معاملات میں دھوکہ اور سودے میں نقصان ہو وہ اپنی سادگی اور ایثار پر فدا ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے ایسا شخص کچھ ڈرسا جاتا ہے۔ اس میں کوئی قدم اٹھانے کا، کوشش کرنے کا یا رسک لینے کا حوصلہ کم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں خود پسندی تو خیر اپنی جگہ پر موجود ہی ہے، اسے خودترسی اور مظلومیت کا نشہ سا رہنے لگتا ہے۔ اس پر ایک دُکھن کی سی لذت کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اور اگر کبھی کسی موقعے پر کوئی دوست اسے دغا نہ دے، کوئی ملازم اس کے ساتھ بددیانتی نہ کرے، دنیا اسے مکمل طور پہ نظرانداز نہ کرے یا کسی کاروبار میں اسے نقصان کی بجائے فائدہ ہو جائے تو اس کا نشہ اکھڑنے لگتا ہے اور اسے حقیقت میں افسوس ہوتا ہے۔

''نذیر صاحب اتنا میٹھا نہ کھایا کریں۔ کچھ خیال کریں۔''

''کاہے کو جی۔؟ شوگر کا علاج تو اپنی مٹھی میں ہے۔'' انہوں نے مٹھی بند کر کے دکھائی۔ ''آپ یقین مانیں جس ہاتھ سے دوا پڑیا میں ڈالی ہو اسی کو چاٹ لوں تو دس دن شوگر نہیں بڑھتی۔''

''حکمت تو واقعی آپ کی کمال کی ہے۔''

''جی ہاں بالکل۔'' انہوں نے اس قدر یقین اور استغنا کے ساتھ میری تائید کی جیسے میں نے کسی اور کی تعریف کی ہو۔

''کوئی نسخہ مجھے بھی بتائیں۔ ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ لوگوں کے نام، ٹیلیفون نمبرز، ضروری کام۔''

''کوئی بڑی بات نہیں۔'' انہوں نے بڑی کوشش کے ساتھ اپنی ایک پنڈلی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر چیز یاد آ جائیگی۔ اور یاد رہے گی۔ سات گریاں لے لیں۔ یہ اپنا بادام کی۔ رات کو انہیں پانی میں بھگو دیں۔ صبح نکال کر چھیل لیں۔ پانی ضائع نہیں کرنا۔ اب لنگری میں ڈالیں اور پیسیں۔ ایک ایک کر کے کالی مرچیں بھی سات ہی ڈال دیں۔ بس اب پیستے جائیں، پیستے جائیں۔ جب اس میں اتنی طاقت آ جائے کہ سوٹا لنگری سے علیحدہ نہ ہو اور لنگری کو اٹھا لے تو نکال لیں۔۔۔''

''لیکن اب وہ نکلے گا کیسے؟'' میں نے نذیر دیوانہ کے نسخے کا جھول پکڑ لینے کی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو بقول آپ کے اپنی طاقت کی وجہ سے لنگری اور سوٹے کے ساتھ چپک کر رہ گیا ہے۔''

''ہاں۔ وہ علیحدہ کیسے ہو گا۔'' نذیر دیوانہ نے مجھے ایک شاندار مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ اس میں میری توجہ کا ثبوت ملنے کی خوشی بھی تھی اور اپنے اندازے کی درستگی کا اطمینان بھی کیونکہ اس مقام پر وہ اسی سوال کی توقع کر رہے تھے۔ پھر وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنی ناک کی سیدھ میں کھڑی کی اور کہا۔

''آپ سے کہا تھا پانی ضائع نہیں کرنا۔اب یہاں وہ پانی کام آئے گا۔قطرہ قطرہ لنگری میں ڈالتے جائیں اور آہستہ آہستہ دوا کو لنگری سے الگ کرلیں۔اب اس میں ہم وزن مکھن ملالیں۔حافظے کے علاوہ خشکی کے علاج کے لئے اور پٹھوں کی طاقت کے لئے بہترین چیز ہے۔''

''ہاں کم ازکم اتنی طاقت تو ملنی ہی چاہئے جتنی اس نسخے کی تیاری کے دوران خرچ ہوئی ہے۔''

نذیر دیوانہ نے میرے اس جملے کو یکسر نظرانداز کر دیا۔

''ابھی اور سنیں۔یہ پانی بڑے کام کی چیز ہے۔لیکن چائے نہیں آئی ابھی تک۔''

''اوہ،معاف کیجئے گا۔''میں نے حنیف کو آواز دی اور اس سے پوچھا کہ چائے میں تاخیر کیوں ہے۔اور اسے دوبارہ ہوٹل بھیجا۔

''ہاں جی اب بتایئے اس پانی کے دیگر فائدے۔''

''ایک رات کا بچا ہوا پانی ہو آپ کے پاس،اس میں دو قطرے سرکے کے ڈال لیں تو کسی بھی بچھو کے کاٹے پہ لگائیں،دم کے دم میں آرام آجائیگا۔۔۔سوائے پارس بچھو کے۔''

''پارس بچھو۔۔۔؟''میں نے حیرت سے دوہرایا۔''یہ کونسا بچھو ہے؟پارس پتھر تو میں نے سنا ہے۔''

نذیر دیوانہ نے ایسے منہ بنا کر ہاتھ جھٹکا جیسے میری کم علمی پر کوئی تبصرہ کرنا نامناسب سمجھ کر چھوڑ دیا ہو۔پھر پوچھا۔

''یہ پارس پتھر ہے کیا؟کیسے بنتا ہے یہ؟''

اگر وہ مجھے موقع دیتے بھی تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔زیادہ سے زیادہ میں یہی کہتا کہ پارس پتھر ایک افسانوی پتھر ہے اور یقیناً کسی فیکٹری میں نہیں بنتا۔جس پر وہ پھر میری لاعلمی پر منہ بناتے۔

''مونٹ اوریسٹ کو فتح کرنے کے لئے جو پہلی ٹیم گئی تھی گوروں کی۔اس کا ذکر پڑھا کبھی آپ نے؟''

میں نے نفی میں سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

''میں بتاتا ہوں۔ایک جگہ اس ٹیم نے پہاڑ پہ دو سوراخ دیکھے۔ایک سوراخ سے بچھوؤں کی ایک قطار نکل رہی تھی اور دوسرے میں داخل ہو رہی تھی۔یہ بڑے بڑے سبز بچھو۔انتہائی زہریلے۔وہ چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔لیکن آپ کو پتا تو ہے کہ گوروں کو ہر کام میں پنگا کرنے کی عادت ہوتی ہے،انہوں نے کیا کیا کہ ایک پتھر اٹھا کر اس سوراخ پہ رکھ دیا جس میں بچھو جا رہے تھے۔کچھ ہی دیر میں وہاں بچھو ہی بچھو ہوگیا۔آس پاس کی زمین ڈھک گئی بچھوؤں سے۔پر یہ بھی ڈرے نہیں،وہیں کھڑے رہے۔وہ کیا ہے کہ تجسس بہت ہوتا ہے ان میں۔پھر کیا دیکھتے ہیں کہ جو قطار نکلتی چلی آرہی تھی اس میں ایک بڑے سبز بچھو کے اوپر ایک چھوٹا سا سنہرے رنگ کا بچھو سوار ہے۔اس کے آگے کے سارے بچھو اسے رستہ دے رہے تھے۔پتھر کے پاس پہنچ کر جو اس نے اچھل کر ڈنک مارا تو پتھر تو جناب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔راستہ کھل گیا۔ٹریفک بحال ہوگئی۔گوروں کی ٹیم میں سے ایک سرپھرے نے نشانی کی خاطر ایک ٹکڑا۔اس پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر

جیب میں رکھ لیا۔اس کے بعد بس پھر ٹیم اپنے راستے پہ چل پڑی۔رات ہوئی تو بستر کھولے،کیمپ لگایا۔صبح کو جب اس گورے نے کسی کام سے اپنی چابیاں نکالیں تو دیکھا کہ وہ تو سونے کی ہوگئی ہیں۔چم چم سنہری رنگ دھوپ میں چمک رہا تھا۔گورا تو بھونچکا رہ گیا۔اچانک خیال آیا۔جیب ٹٹولی تو پتھر غائب۔اب سمجھ آئی جناب، یہ کہانی ہے پارس پتھر کی۔اور یہ پتھر بنتا ہے پارس بچھو کے ڈنک سے۔پیچھے رہ گیا وہ گورا۔تو ڈاکٹر صاحب، ٹیم تو اپنے سفر پہ آگے روانہ ہوگئی اور وہ گورا وہیں سے پلٹ پڑا۔اس پتھر کی تلاش میں۔واپسی پہ بھی ٹیم کو وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔پھر کبھی کبھی کسی چرواہے، یا وہاں سے گزرنے والے نے بتایا کہ اس حلئے کا ایک آدمی بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں زمین میں نظریں گاڑے کچھ کھوجتا پھرتا ہے۔تلاش کی دھن نے اسے پاگل کر دیا۔پھر خبر نہیں اس کا کیا بنا۔''

نذیر دیوانہ کی کہانی ختم ہوئی تو وہ نہائت سنجیدگی سے اپنی ایک موٹی سی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی کو گھمانے کی کوشش کر رہے تھے اور میری نظریں باہر کے دروازے پر جمی تھیں جہاں ایک بوڑھا مریض لاٹھی ٹیکتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔

 

غیرت کا قتل

سڑک منڈی بہاالدین سے نکلی تو کئی گھنٹے پہاڑوں میں ہی چکراتی رہی۔ کبھی کبھی تو چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں زمانے گزر گئے۔ انہوں نے سرائے عالمگیر کی نہر پہ ہیڈ رسول پار کیا تو گرمی کی شدت سہ پہر میں تحلیل ہو رہی تھی۔ گاڑی نے نہر کا کنارا پکڑا تو ان کے سفر کا مشکل حصہ گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر سرشار کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ ان کی اونچی آواز اور مسلسل بولتے رہنے سے آپ کے سر میں درد ہو جائے، آپ ان سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ کسی بات پہ جھنجھلا بھی سکتے ہیں، لیکن آپ بور ہرگز نہیں ہوسکتے۔ وہ ڈرائیور کی پیشہ ورانہ مہارت پر مسلسل کڑی تنقید کرتے رہیں گے۔ اسے لگاتار مشورے اور تجاویز بھی دیتے رہیں گے جن میں ہوسکتا ہے کہ ڈرائیونگ سکول میں داخل ہونے کا مشورہ بھی شامل ہو، فلموں، کتابوں اور اداکاروں کی ذاتی زندگی پر تبصرے کریں گے، اپنی ملازمت کے دنوں کے واقعات اور مختلف مشہور شخصیات سے متعلق دلچسپ قصے سنائیں گے اور اس دوران سیل فون پہ اپنے وکیل اور پٹواری کے ساتھ مستقل رابطے میں بھی رہیں گے۔

ڈاکٹر سرشار سرکاری ملازمت سے ریٹائیر ہو چکے تھے۔ وہ محکمہ ءصحت میں کئی اعلی عہدوں پہ فائز رہے تھے۔ آج کل وہ اس فرم کے لئے کنسلٹنسی کر رہے تھے جس میں فراز ملازم تھا۔ اسی سلسلے میں فراز اور وہ دو دن پہلے منڈی بہاالدین آئے تھے اور آج اپنا کام مکمل کر کے لاہور واپس جا رہے تھے۔

''اس نہر کے کنارے ایک مرڈر ہوا تھا۔'' ڈاکٹر سرشار نے اچانک کہا۔ ''دادے نے آپ اپنی پوتی کو مروا دیا تھا۔''

''اپنی ہی پوتی کو؟'' فراز نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''وہی غیرت ویرت کا چکر۔'' ڈاکٹر سرشار نے کہا۔ ''یہ بات ہے نائینٹین ایٹی نائین کی، اور واز اٹ ایٹی ایٹ؟''

وہ آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ گئے۔

''خیر کوئی بھی سال ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہے پرانی بات۔'' فراز نے کہا۔ اسے اس وقت بہت الجھن ہوتی تھی جب لوگ ایسے موقعوں پہ بالکل درست سال کا تعین کرنے کی کوشش میں پڑ جاتے تھے۔

''ہاں پرانی بات ہے۔ میں ان دنوں چیف کیمیکل اگزامینر تھا۔ ہماری فرانزک لیب کے پاس اس کے سامپلز آئے تھے۔''

''تو آپ چیف کیمیکل اگزامینر بھی رہے ہیں؟'' فراز نے پوچھا۔

''یس، فارٹو ییئرز۔۔'' ڈاکٹر سرشار نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کھڑی کر کے کہا۔''ایک ایک رپورٹ پہ لاکھوں کی آفر آتی تھی۔''

''پھر۔۔۔؟''

''نہیں۔ میں نے رشوت کبھی نہیں لی۔ آئی مے ناٹ بی دیٹ پائیس آ پرسن، بٹ رشوت۔ نو!''

''اینڈ لیس ٹو واٹ؟'' فراز نے شرارت سے پوچھا۔

''رپورٹ میں میں نے کبھی گڑبڑ نہیں کی۔'' سرشار صاحب بولے۔''ہاں، ممکن ہے مجھ سے کبھی غلطی ہوئی ہو، بٹ نو ڈیلیبریشن۔ ویسے ٹیمپٹ یشنز (temptations) کے علاوہ پریشرز (pressures) بھی بہت تھے اس سیٹ پہ۔ ایون (even) منسٹرز تک کے فون آجاتے تھے۔ آف کورس ان ڈائیریکٹلی (Off course indirectly)، لیکن میں نے ایک اصول بنایا ہوا تھا۔ جتنی جلدی ہو سکے رپورٹ نکال دو۔ ڈونٹ لیٹ اٹ سٹ آن یور ٹیبل (Don't let it sit on your table.)''

''سرغستاخی ماف۔'' ڈرائیونگ سیٹ سے کینیتھ کی آواز آئی۔''آپ کی بات چیت کے اندر دخل اندازی کرنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن اس قتل کا کیا ہوا؟'' وہ بہت سنبھل سنبھل کر بات کرتا تھا جیسے کہیں سے لکھا ہوا پڑھ رہا ہو۔

''ہاں وہ نہر کے کنارے والا قتل، سو یو آر انٹرسٹڈ؟ (So you are interested?)''

سرشار صاحب کی گفتگو ہمیشہ اردو، انگریزی اور پنجابی کا ملغوبہ ہوا کرتی تھی۔ وہ تینوں ہی زبانیں بڑی تیزی سے بولتے تھے لیکن صرف کسی ایک میں دیر تک گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔

''اصل میں گاؤں میں ایک میلی تھی۔ کیہڑا پنڈ سی، آئی ریمیمبرڈ دی نیم ونس (I remembered the name once) اور کینیتھ تم جس لین میں گاڑی چلا رہے ہو اس کی سپیڈ کے مطابق چلاؤ۔ یا پھر درمیان میں آجاؤ، یو آر گوئینگ ٹو سلو۔''

''بہتر سر!'' کینیتھ نے کہا۔

''بہر حال او بندہ باہر گیا سی۔ ناروے۔ کمائی واسطے۔ ہی گاٹ سیٹلڈ دیئر۔'' ڈاکٹر سرشار نے بتانا شروع کیا۔''اوہدی اپنی فیمیلی وی ماڑی نئی سی۔ کوئی وڈے چوہدری وی نئی سن۔''

''بڑے چوہدری تو کمائی کے لئے باہر جاتے بھی نہیں۔'' فراز نے لقمہ دیا۔

''یو یلی دے ڈونٹ۔'' سرشار صاحب نے کہا۔''ہاں، اگر کمائی کے لئے جائیں تو بڑی کمائی کے لئے جاتے ہیں۔ بیک ٹو دی سٹوری، وہ بندہ وہاں ناروے میں سیٹل ہو گیا۔ بیوی، بچے بھی وہیں بلا لئے۔ بچے ادھر ہی پلے بڑھے، تعلیم حاصل کی۔ وہ ہمارا بندہ۔ یار اس کا نام تو مجھے پتا نہیں لیکن ہم اسے بشیر کہہ لیتے ہیں۔ تو بشیر صاحب بڑے چین سکون سے زندگی گزار رہے تھے وہاں۔ اپنے پنڈ کا بھی کبھی کبھار چکر لگتا رہتا تھا۔ اس کی کمائی سے ادھر اس کے باپ نے بڑی جائیداد بنا لی تھی۔ بھائی وغیرہ بھی بڑے سوکھے ہو گئے تھے۔

لیکن جیسا کہ پاکستانیوں کے ساتھ عام طور پہ ہوتا ہے، غیر ملک میں بچوں کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے بشیر صاحب کو بھی پریشانی شروع ہوگئی۔ اصل میں اسے لڑکوں کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی تانیہ کی تھی۔''

''جی ہاں، ہم پاکستانیوں کو باہر کے ملکوں میں نہ اپنے بگڑنے کی فکر ہوتی ہے، نہ اتنی اپنی نسل کے بگاڑ کی۔ اگر ہوتی ہے تو بس بچیوں کے خراب ہونے کی۔''

''اگزیکٹلی۔ اب جیسے جیسے تانیہ بڑی ہوتی جارہی تھی بشیر کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ وہاں آپ اپنے بچوں کو اس طرح۔ اس طرح نگرانی میں نہیں رکھ سکتے۔ چیک نہیں کرسکتے انہیں جیسے یہاں کرتے ہیں۔'' سرشار صاحب کو اپنی پسند کے الفاظ نہیں ملے لیکن انہوں نے جیسے تیسے جملہ مکمل کیا۔

''مزے کی بات ہے کہ ہمارے معاشروں کا یہ تضاد، یہ کلچرل ڈفرنس کبھی اس وقت نظر نہیں آتا جب ہم وہاں سیٹل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ وہاں کی جس آزادی اور آزادروی سے ہم خود بھرپور لطف اٹھاتے ہیں وہ ہمیں صرف اس وقت کھلنا شروع ہوتی ہے جب ہماری اولاد، خاص طور پہ بیٹی جوان ہوتی ہے۔''

فراز اس دوہرے معیار پر شاید ابھی کچھ اور بھی بولتا کہ سرشار صاحب کا فون آگیا۔ وہ کچھ دیر اونچی آواز میں الفاظ دوہرا دوہرا کے شاید اپنے پٹواری سے بات کرتے رہے۔ فون بند ہوا تو وہ کہانی کا سرا بھول چکے تھے۔''یارا یہہ پٹواری بڑے بدھوندے نے۔ میں اس کو ہڑے نوں پیسے وی لا بیٹھا آں پر کم فیر وی نئی کردا۔''

''اب تو سر، حکومت نے اس سلسلے میں سنا ہے کہ بڑی اصلاحات کردی ہیں۔''

''سرکھوتے دا اصلاحات کیتیاں نے۔''

''مرڈر تو مکمل کریں سر!''

''ہاں، کہاں تھا میں؟ یس، اینی ہاؤ، دیٹ تانیہ واز آ گڈ گرل۔ حجاب وجاب پہنتی تھی۔ تعلیم میں بھی اچھی تھی۔ بلکہ اچھی خاصی اچھی۔ سوہنڑی وی رج کے سی۔ لیکن اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ گھر سے سکول اور سکول سے گھر۔ اور اپنے سکول فرینڈز کے ساتھ کبھی کبھی کی آؤٹنگ۔

''تو یوں سمجھئے کہ حالات قابو میں تھے۔ لیکن بشیر کو فکر تھی کہ آخر کب تک۔ لڑکے اس کے دونوں پڑھائی چھوڑ گئے تھے۔ لازمی گریڈز کر کے۔ ایک باپ کے سٹور پہ تھا، دوسرا کوئی چھوٹی موٹی جاب کررہا تھا۔ کبھی کبھی پی پلا بھی لیتے تھے۔ اور دوسرے غیر شرعی شغل بھی کرتے رہتے تھے''

''لیکن آپ کو یہ ساری تفصیلات کیسے ملیں؟'' فراز نے پوچھا۔

''او میرا ایک گرائیں بشیر کا پڑوسی تھا نا روے میں۔ پھر وہ بعد میں پاکستان واپس آگیا۔ ہماری زمینوں کے بنے لگتے تھے۔ پٹواری کے

پاس ملاقات ہو جاتی تھی، پھر دوستی ہو گئی۔ وہ بشیر کے تمام حالات سے واقف تھا، پھر پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ تو ایک اوپن سیکریٹ تھا۔''

''تو بشیر صاحب کا خیال ہو گا کہ بیٹی کو اب پاکستان میں بیاہ دیں۔ وہاں سے بھانجیوں بھتیجیوں کو بہوئیں بنا کے لائیں اور سائیکل پھر سے شروع ہو جائے۔''

''اگزیکٹلی۔'' سرشار صاحب نے کہا۔

وہ نہر پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب ایک ایسی صاف ستھری اور ہموار سڑک پہ تھے جو انہیں جی ٹی روڈ کی طرف لیجا رہی تھی۔ سڑک پہ ٹریفک بہت کم تھا۔ دن کا اجالا ابھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن اطراف میں بنے ہوئے کم و بیش ایک جیسے خوبصورت بنگلوں کے برآمدوں اور سڑک کے رخ والے اکا دکا کمروں میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔

''اچھے خوبصورت گھر ہیں۔'' فراز نے کہا۔

''ہاں جی۔ یہ کوٹھیاں مری اور کشمیر میں رہنے والے غریب لوگوں کے لئے بنی ہیں۔'' سرشار صاحب نے کہا۔

''جی؟'' فراز اور کینیتھ نے اکٹھے کہا۔

''بھئی یہ کوٹھیاں زیادہ تر دوسرے ملکوں میں سیٹلڈ (Settled) پاکستانیوں نے بنوائی ہیں۔ فیملیز ان کی ان کے ساتھ باہر ہیں۔ یہ بنگلے خالی پڑے تھے۔ ان کی خبر گیری کے لئے اگر کسی رشتے دار کو رکھیں تو خطرہ ہے کہ وہ قبضہ ہی نہ کر لے۔ چنانچہ ان میں صرف چوکیدار رہتے ہیں۔ یعنی وہ غریب آدمی جو ساری زندگی ایسا کوئی گھر بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، پریکٹیکلی اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ اس میں رہ کر گزار دیتا ہے۔ کچھ نے تو اپنے بیوی بچے بھی ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کبھی دو چار سال بعد مالک آتے بھی ہیں تو ایک آدھ ماہ کے لئے وہ سرونٹ کوارٹر میں شفٹ ہو جاتے ہیں اور پھر واپس۔''

''اور مالکوں کو اس بات کا پتا ہوتا ہے؟''

''ہاں، ہاں۔ اصل میں پراپر دیکھ بھال اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ صفائی ستھرائی کا انتظام، چھتوں، دیواروں کی حالت پہ نظر رکھنا، سانپ بچھو اور نشے کے عادی لوگوں سے حفاظت، بجلی پانی گیس کی مسلسل فراہمی کا خیال۔ یہ سارے کام رہ کر ہی ہوتے ہیں۔''

''تو بل چوکیدار خود بھرتے ہیں؟'' فراز نے پوچھا۔

''نہیں جی، وہ کہاں سے بھر سکتے ہیں۔ مالک ان کو اس کام کے لئے اور وقتاً فوقتاً مرمت وغیرہ کے لئے رقم بھیجتے رہتے ہیں۔''

''پھر وہی سوال۔ آپ کو کیسے پتا ہے؟''

''میرے گاؤں کے بڑے لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ کوٹھیوں کا سٹائل بڑا ٹیپکل ہے، یہ سڑک تو مشہور ہے ولائت والوں کی کوٹھیوں کے لئے۔''

''سر، وہ قتل کا کیا ہوا؟'' کینیتھ کو خدشہ ہوا کہ گفتگو اصل موضوع سے بالکل ہی نہ ہٹ جائے۔

''ہیئر وی ہیو ون کانسسٹنٹ پرسن۔(Here we have one consistent person)'' سرشار صاحب ہنس کر بولے۔ ''فکر نہ کر کینیتھ، ساڈے لہور پہنچن توں پہلاں کڑی قتل ہو جاوے گی۔''

''پتا نہیں کینیتھ کو قتل میں دلچسپی ہے یا لڑکی میں؟'' فراز نے کہا۔

''نئیں سر، میرے ذہن میں تو صرف تجسس پیدا ہو رہا ہے کہ آپ جو کہانی بیان فرما رہے ہیں، اس کا انجام کیا ہوگا۔'' کینیتھ نے ٹھہر ٹھہر کر کہیں سے کچھ پڑھ کر کہا۔

''انجام کیا ہونا ہے! انجام تو میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ لڑکی کو نہر کے کنارے قتل کر دیا گیا۔ اور بس۔''

''لیکن کیوں۔؟''

''ہاں، یہ سوال زیادہ صحیح ہے،'' ڈاکٹر سرشار نے کہا۔ ''لیکن اس کا جواب میں تجھے تب دوں گا جب مجھے کہیں سے اچھی سی کافی پلائے گا''

وہ لوگ منڈی بہاالدین سے جو بسکٹ اور چپس لے کر چلے تھے وہ کب کے ختم ہو چکے تھے۔ پانی ابھی باقی تھا لیکن وہ اتنا گرم ہو چکا تھا کہ پینے کے لئے پیاس کے علاوہ حوصلہ بھی چاہئے تھا۔

''ایسا کرو کینیتھ، اب کوئی اچھا سا پٹرول پمپ دیکھ کر روک لو۔ ہم وہیں نماز بھی پڑھ لیں گے اور اسی کے سٹور سے کوئی چائے کافی بھی پی لیں گے۔''

''ویسے یار فراز، آپ کو وہ مٹھائی رکھ لینی چاہئے تھی۔'' سرشار صاحب کو اچانک وہ مٹھائی یاد آ گئی۔ شاید بھوک کا احساس جاگا تھا۔ وہ جس کمپنی کا آڈٹ کرنے آئے تھے اس کے مینیجر نے ان کی گاڑی میں مٹھائی کا ایک خاصا بڑا ڈبہ رکھوا دیا تھا۔ لیکن فراز نے واپس کر دیا۔ مینیجر نے بہت اصرار کیا لیکن فراز کسی صورت نہ مانا۔

''سر، وہ مٹھائی رکھ لیتے تو سارے دن کے روزے کا کیا فائدہ ہوتا!'' انہوں نے آڈٹ کے دوران وہاں سے پانی تک نہیں پیا تھا۔

''لیکن یار آڈٹ تو ختم ہو گیا تھا، اور وہ تو اس شہر کی سوغات تھی۔''

''سر، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ایک ریپوٹیشن بن جائے۔ لوگ ہمارے بارے میں کہیں کہ یہ تو کہیں سے پانی تک نہیں پیتے۔''

''آئی نو، آئی نو۔'' سرشار صاحب نے سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے ایسے لگا کہ جیسے اسے انسلٹ فیل ہوئی ہو۔ بھئی دیکھو نا، وہ خرید چکا تھا، بڑے مان سے اس نے گاڑی میں رکھوایا تھا۔''

''یس سر، آئی اولسو فیلٹ سوری فار ہم۔ لیکن میری مجبوری تھی، اینڈ آئی اپولوجائیزڈ۔'' فراز نے کہا۔ ''آئے اپولوجائیزڈ کوائیٹ اے لاٹ(I apologized quite a lot.)''

''خیراب ہم راہوالی سے قلفی ضرور کھائیں گے۔''

''ضرور ضرور۔''

انہیں اپنے مطلب کا پٹرول پمپ سٹیشن ملا تو سورج ڈھل چکا تھا۔ فراز کا دل چاہ رہا تھا کسی طرح وضو کی ٹوٹی کے نیچے گھس جائے۔ اس نے خوب اچھی طرح اور خاصی دیر تک وضو کیا۔ اسے احساس ہوا کہ خاص طور پہ پاؤں دھونا کس قدر راحت بخش عمل ہے۔

''کبھی کبھی لگتا ہے کہ جوتوں موزوں کا سب سے بڑا مزہ انہیں اتارنے میں ہے۔'' اس نے ڈاکٹر سرشار سے کہا جو نماز پڑھنے کے لئے کرسی سیدھی کر رہے تھے۔

''ویل سیڈ (well said)، اچھا یہ بتائیں، یہاں قصر پڑھیں یا پوری۔؟''

''حضرت، یہاں بھی قصر نہیں پڑھیں گے تو پھر کہاں پڑھیں گے؟' لیکن مغرب میں کیسی قصر، پوری تین رکعات پڑھنی ہیں۔ اور میں تو اس کے بعد عشاء بھی پڑھنے لگا ہوں۔''

سٹور میں کافی کا انتظام بھی تھا لیکن فراز نے چائے پر اکتفا کیا۔

''آئے تھاٹ یو لائیکڈ کافی؟ (I thought you liked coffe?)'' سرشار صاحب نے اپنا کپ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''دیٹ آئی ڈو (That I do.) لیکن میرا ایک کنسرن ہے۔ بیڈ کافی از ورس دین بیڈ ٹی (Bad coffee is worse than bad tea) کافی اچھی نہ بنی ہو تو بالکل نہیں پی جا سکتی، چائے پھر بھی برداشت ہو جاتی ہے۔ دوسرے چائے عام طور پہ گزارے لائق بن ہی جاتی ہے لیکن کافی کم ہی لوگ اچھی بناتے ہیں۔''

''بہر حال مائے سسٹم نیڈڈ آ بٹ آف کیفین (My system needed a bit of caffien.)''

سفر دوبارا شروع ہوا تو ڈاکٹر سرشار کا کوئی فون آ گیا۔ ان کی گفتگو سے فراز نے اندازہ کیا کہ وہ فارم ہاؤز پہ اپنے ملازم سے بات کر رہے تھے۔ کینیتھ نے فراز سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ سرشار صاحب اونچا بولتے تھے۔ اور فون پہ بہت اونچا بولتے تھے۔ انہوں نے فون بند کیا تو فراز نے کینیتھ سے کہا۔

''اللہ کے بندے تمہیں یہ SOP نہیں پتا کہ جس کمرے یا گاڑی میں ڈاکٹر سرشار فون پہ بات کر رہے ہوں وہاں کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔'' سرشار صاحب یہ بات سن کر ہنسے اور کہا۔

''نہیں میں واقعی اچا بولناں۔''

''آپ اصل میں اپنے ہاتھ میں موجود اس آلے کے جادو پہ یقین نہیں رکھتے۔'' سرشار صاحب پھر ہنسے۔

''سر شرشار، وہ لڑکی کیسے مری؟''

اس بار فراز ہنسا۔ ''گڈ!'' اس نے کہا۔ ''ایک تو سرشار صاحب کے نام میں پہلے ہی سے سر موجود ہے۔ دوسرے تم نے اس میں سے ایلیشن (Elation) نکال کر انفلیمیشن (inflammation) بھر دی ہے۔''

''سر میں معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میں سر کا نام میری زبان پہ چڑھتا ہی نہیں ہے۔'' کینیتھ بولا۔

''ڈزنٹ میٹر (Doesn't matter) اکثر لوگ میرے نام کو غلط پرونا ؤنس (pronounce) کرتے ہیں۔''

''سر جی آپ یہ مرڈر کا واقعہ سنا دیں تو میں بھی آپ کو ایک حیرت انگیز واقعہ سناؤں گا۔''

''نہیں پھر پہلے تم سناؤ۔'' ڈاکٹر سرشار نے کہا۔

''ویسے سرحق تو آپ کا بنتا ہے۔ آپ بڑے بھی ہیں اور پہلے سے سنا رہے ہیں۔''

''نہیں، نہیں، نہیں! میں سناؤں گا، بالکل سناؤں گا۔ لیکن پہلے ذرا حیرت انگیز واقعہ ہو جائے۔ ویسے وی بول بول کے میرا منہ تھک گیا اے۔ آئے کین یوز آ بٹ اوف ریسٹ (I can use a bit of rest.)''

''سر جیسے آپ کا حکم۔'' کینیتھ نے کہا اور پھر آغاز کے طور پہ کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''یہ سر شیخوپورہ کا کوئی گاؤں تھا۔ نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ ادھر کے ایک زمین دار کا لڑکا تھا۔ سر وہ اچھا بھلا کالج یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ کوئی اڈونچر۔ وہ نا، اپنی زندگی سے بڑا بور ہو گیا تھا۔ ایک جیسی روز کی روٹین۔ تو اس نے سوچا کوئی نیا کام کرے۔ کوئی ایکیو یٹی۔ اس نے کیا کیا سر، کہ ایک گاڑی کرائے پہ لی۔ رینٹ اے کار سے۔ ڈرائیور سمیت۔ سارا دن اسے لے کر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ شام کو اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر سر، اس نے ڈرائیور کو چھری ماردی۔۔۔''

''چھری ماردی؟ وہ کیوں؟'' سرشار صاحب نے فوراً پوچھا۔

''بس سر، ویسے ہی، یہ دیکھنے کے لئے کہ قتل کیسے کرتے ہیں۔''

''مطلب ڈرائیور مر گیا؟''

''جی سر۔''

''تو کیا بنا اس لڑکے کا؟''

''کچھ نئیں سر، وہ چھوٹ گیا۔ پہنچ والے لوگ تھے۔ پیسہ بھی انہوں نے کھلا لگایا۔ شاید مقتول کے وارثوں کو بھی کوئی رقم دی۔ لڑکا بچ گیا۔''

''ہوں۔''

''اسی نے بعد میں اپنے دوستوں وغیرہ کو یہ ساری باتیں بتائیں۔ ان سے پھر اور آگے نکل گئیں۔''

''بہر حال تمہارا واقعہ حیرت انگیز تو نہیں تھا، خوفناک ضرور تھا۔'' فراز نے لمبا سانس لے کر کہا۔

''قتل کی وجہ کا جہاں تک تعلق ہے، دی سٹوری ہیڈ این ایلیمنٹ اوف سر پرائیز۔ (The story had an element of surprize.)'' سرشار صاحب نے کہا۔

''اینی ہاؤ، اٹ واز شاکنگ (Anyhow it was shocking.)'' فراز نے کہا۔'' اب سر، آپ کے قتل، میرا مطلب ہے آپ کے والے قتل کی طرف چلتے ہیں۔''

''ہوں۔'' سرشار صاحب نے ہنکارا بھرا، خوب زور سے کھانسے اور گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے باہر تھوکا۔

''مسئلہ یہ ہوا کہ تانیہ کا ایک انگریز لڑکے کے ساتھ چکر شروع ہو گیا۔''

''یعنی جو چلے تو جاں سے گزر گئے۔'' فراز نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر سرشار نے پوچھا۔

''یعنی یا تو کوئی دوستی ووستی ہی نہیں تھی اور یاری لگائی تو انگریز سے۔''

''وہ لڑکا اس کی خاطر مسلمان ہونے کے لئے تیار تھا، شاید ہو بھی گیا تھا۔ لیکن باپ سخت مخالف تھا۔ کیہہ ناں رکھیا سی اسی اوہدا؟''

''بشیر۔'' کینیتھ نے بتایا۔

''ہاں تو بشیر نے لڑکی کو بڑا سمجھایا۔ جتنی سختی کر سکتا تھا وہ بھی کی لیکن تانیہ نہیں مانی۔''

''ویسے سر ایک ضمنی سوال ہے۔'' فراز نے کہا۔'' باپ کا نام تو آپ نے فرضی رکھا ہے اور پھر بھی بھول جاتا ہے، لیکن لڑکی کا نام پکا یاد ہے آپ کو۔''

''بس یار مجھے ذرا مردانہ نام کم ہی یاد ہوتے ہیں۔ دوسرے لڑکی بیچاری مر بھی تو گئی نا۔''

''اچھا خیر، تانیہ اس انگریز کے ساتھ تعلق سے دستبردار ہونے پہ تیار نہیں ہوئی۔''

''نہیں جی، بالکل نہیں۔ بشیر کی تو نیندیں اڑ گئیں۔ کبھی بیوی سے لڑائی، کبھی بچوں کو ڈانٹ پھٹکار۔ دکان پر بھی دھیان نہیں رہا۔''

''لیکن آخر کیوں؟'' فراز نے پوچھا۔'' جب وہ لڑکا مسلمان بھی ہو گیا تھا اور ظاہر ہے کہ دونوں باقاعدہ شادی کرنا چاہتے ہوں گے۔''

''بھائی صاحب، دنیا میں سب لوگ ہر بات کو صرف دین کے ترازو میں نہیں تولتے، کہ مسلمان ہو گیا تو بس باقی سب خیر ہے۔ جٹاں دی کڑی تے انگریز نال ویاہ۔ بشیر کے لئے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ کسی صورت بھی نہیں۔ آخر اس نے فون کر کے اپنے باپ کو ساری بات بتائی۔''

''پاکستان میں؟''

''جی ہاں، اپنے گاؤں میں۔ اس کے باپ نے کہا لڑکی کو کسی طرح ایک بار یہاں لے آؤ۔ اس سے جھگڑا مت کرو۔ اس پہ یہی ظاہر کرو کہ تم مان گئے ہو اور خاندان برادری کو راضی کرنے کے لئے اس کے ساتھ پاکستان آنا چاہتے ہو۔

تانیہ کو یوں تو خاندان برادری کو منانے کی پروا نہیں تھی لیکن اس نے سوچا کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔ وہ باپ کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ ویسے بھی وہ ایک یوروپین ملک کی سٹیزن تھی۔ اٹھارا سال سے زیادہ عمر۔ پڑھی لکھی سمجھدار، فل آف کانفیڈینس۔ اپنے حقوق سے پوری طرح آگاہ۔ اسے یقین تھا کہ بہرحال اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

ادھر گاؤں میں بڑی آؤ بھگت ہوئی اس کی۔ کھیت اور کھالے، ٹیوب ویل اور ٹریکٹر، یہ سب چیزیں نئی تھیں اس کے لئے۔۔۔''

''نئی تھیں؟ وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی گاؤں؟'' فراز نے حیرت سے پوچھا۔

''او یار مینوں کی پتا! میں نے تو ذرا کہانی میں خوبصورتی بڑھانے کے لئے کہہ دیا ہے۔''

''ویسے سر، اس کہانی میں اگر کچھ نہیں ہے تو وہ خوبصورتی ہے۔'' فراز نے کہا۔ پھر سرشار صاحب کی طرف دیکھ کر وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے، آپ نے شروع میں ہی بتا دیا ہے کہ دادے نے پوتی کو قتل کرا دیا تھا۔''

''بہرحال وہ خوش تھی وہاں۔ سب راضی باضی تھے۔ بظاہر۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ پھر ایک دن وہ اپنے نانکے گاؤں گئی۔ بشیر کے باپ نے، یعنی تانیہ کے دادے نے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا۔ پیسے ویسے بھی لگا دیے اس کو۔ اس نے بیان دینا تھا کہ تانیہ نے اسے رستے میں اتار دیا تھا کہ وہ بیٹھک چھٹی پہ گھر کا چکر لگا لے۔ واردات گاڑی کے نہر میں جا گرنے کی نظر آنی تھی۔''

''کینیتھ کی کہانی میں ڈرائیور مقتول تھا، اس میں قاتل ہے۔'' فراز نے کہا۔

''ڈرائیور نے اپنے کچھ دوستوں کو بھی بلا لیا تھا۔ مقررہ مقام پہ نہر کے کنارے اس نے گاڑی روکی۔ اس کے دوست بھی وہیں چھپے ہوئے تھے۔ ویران جگہ تھی۔ ان دنوں تو نہر کے کنارے یہ علاقہ بالکل ہی سنسان ہوا کرتا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتایا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا اور ہاتھ بھی باندھے گئے تھے۔ وہ اسے درختوں میں لے گئے اور دادے کی ہدایت پہ عمل کرنے سے پہلے اپنا بونس وصول کیا۔ پوسٹ مارٹم کی ریپورٹ سے پتا چلا کہ پانی میں پھینکنے سے پہلے اسے قتل کیا گیا تھا اور قتل کرنے سے پہلے اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ شی واز ریپڈ بیفور شی وز کلڈ۔''

سڑک کے کنارے اجڑے ہوئے درخت اندھیرے میں بھوت دکھائی دے رہے تھے۔

 

کاروبار

میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تو ابا جی نے مجھے ڈاکٹر لطیف کے کلینک پہ رکھوا دیا۔ مقصد کام سیکھنے یا پیسے کمانے سے زیادہ یہ تھا کہ لڑکا بری صحبت میں نہ پڑے۔ رزلٹ آنے اور پھر اگلی کلاسوں کے داخلے کھلنے میں ابھی بہت وقت باقی تھا اور اتنا بیکار وقت ان کے خیال میں کسی بھی نوجوان آدمی کو خراب کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شروع میں مریضوں کو ٹوکن دینے کا کام میرے سپرد کیا پھر دو تین ہفتوں کے بعد باہر کی لکھی ہوئی دوا بھی مجھ سے منگوانے لگے۔ رفتہ رفتہ مریضوں کو دوا سمجھانا، ان سے پیسے وصول کرنا اور باہر کے بلوں کی ادائیگی بھی میرے ذمے ہوگئی۔ دوسرے لڑکے جو کلینک پہ کام کرتے تھے، زیادہ تر ڈسپنسر تھے۔ وہ پرچی کے مطابق دوا بناتے تھے، ڈرپ ٹیکے لگاتے تھے اور مرہم پٹی وغیرہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر لطیف کے پاس کام بہت تھا۔ لوگ کہتے تھے ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ ہوگی۔ جبھی تو دور دور کے دیہاتوں سے لوگ ہر طرح کی بیماریاں اور تکلیفیں لئے ان کے پاس آتے تھے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب بڑے روکھے پھیکے آدمی تھے۔ مریضوں کو زیادہ وقت بھی نہیں دیتے تھے۔ بس ایک لمحے کے لئے نبض پکڑتے، ٹونٹی مریض کے سینے اور کمر پہ لگاتے، اور جتنی دیر میں مریض اپنی تکلیف بیان کرتا، وہ پرچی لکھ کر ڈسپنسر کے ہاتھ میں تھماتے۔ یوں وہ صبح سے شام تک سو سے اوپر مریض دیکھ لیتے تھے۔ بیچ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ کرتے جس میں گھر سے لایا ہوا ناشتہ کرتے، چائے سگریٹ سے شوق کرتے اور کلینک ہی کے اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں کچھ دیر کو لیٹ جاتے۔ شام کو کلینک بند کرنے سے پہلے وہ ساری رقم اکٹھی کرتے، حساب کتاب کے رجسٹر ڈائریاں سنبھالتے اور گھر روانہ ہو جاتے۔

ڈاکٹر لطیف کی کوئی ایک مقرر فیس نہیں تھی۔ مرض کی نوعیت اور مریض کی حالت کے مطابق اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ وہ جو بھی فیس مناسب سمجھتے، کوڈ ورڈز میں نسخے کی پیشانی پہ لکھ دیتے تھے۔ ہم میں سے جو بھی مریض سے پیسے لیتا تھا وہ دوائی اور ٹیکوں وغیرہ کی قیمت اس میں شامل کر کے وصولی کر لیتا۔ اس فیس کے علاوہ دوائیوں میں کافی بچتا تھا اور خاص طور پہ ڈرپوں سے تو بہت آمدنی ہوتی تھی۔ پھر میڈیکل سرٹیفیکیٹ بنوانے کے لئے بھی بہت لوگ آتے تھے۔ کچھ فٹنس کا سرٹیفیکیٹ لیتے اور کچھ بیماری کا۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب اس طرح کے سرٹیفیکیٹ بھی بلا جھجک بنا دیتے تھے اور اس سلسلے میں سچ جھوٹ کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔ یوں بھی وہ اخلاقیات کے کچھ بہت اونچے درجے پہ فائز نہیں تھے۔ ڈاکٹر لطیف کوئی دینی مذہبی آدمی بھی نہیں تھے۔ کم از کم میں نے تو انہیں کبھی نماز پڑھتے بھی نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کے بارے میں تو یہ مشہور تھا کہ روزانہ رات کو پینے پلانے کا شغل بھی کرتے ہیں۔ ان کے پرانے ڈسپنسرز کا خیال تھا کہ انکی آنکھوں کے نیچے ورم اسی بات کی نشانی تھی۔ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ انکی بیوی بھی اسی لئے انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس وجہ سے اور ان

کی بدمزاجی کی وجہ سے۔ بچے کہیں ملک سے باہر رہتے تھے اور ڈاکٹر لطیف ایک بہت بڑے گھر میں صرف ایک پرانے ملازم کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم میں سے کبھی کوئی گوشت سبزی وغیرہ ڈاکٹر صاحب کے گھر چھوڑنے جاتا تو اسی کے حوالے کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ درمیانہ قد، گندمی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، بال زیادہ تو سفید ہو چکے تھے لیکن تھے خوب گھنے۔ داڑھی مونچھ کی شیو کرتے تھے، اور خوب سلیقے سے کرتے تھے۔ لباس بھی ڈھنگ کا پہنتے تھے۔ پھر چہرے کی سنجیدگی۔ نئے مریض تو انہیں دیکھ کر ہی متاثر ہو جاتے تھے۔

ڈاکٹر لطیف کے پاس میڈیکل ریپ بھی بہت آتے تھے۔ بیچارے، ڈاکٹر صاحب سے ایک آدھ منٹ ملنے کے لئے کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی تو کلینک میں جگہ نہ ہوتی تو بیگ اٹھائے باہر گلی میں کھڑے رہتے۔ وہ بہت تحفے لاتے تھے۔ گھڑیاں، کیلنڈر، نوٹ بکس، ڈائریاں، وزن کرنے کی مشینیں، قلم، پرس، اور طرح طرح کی آرائیشی چیزیں۔ ان میں سے کچھ تو ڈاکٹر صاحب کی میز پر سج جاتیں اور کلینک میں جگہ پالیتیں اور باقی سب تھیلے میں بھر کر ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں رکھ دی جاتیں اور وہ گھر جاتے ہوئے ساتھ لے جاتے۔ یہ میڈیکل ریپ کارٹن بھر بھر کے سیمپل کی دوائیاں بھی دے جاتے۔ ان مفت کی دواؤں کو پیکٹوں میں سے نکال کر کلینک کے سٹور میں رکھ دیا جاتا اور وہاں سے وہ مریضوں میں کھپ جاتیں۔ دوسری دواؤں کی طرح۔ بلکہ ترجیحی بنیادوں پہ۔ یہ تو بالکل ہی مفت کی آمدنی تھی۔ بہر حال یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی کسی غریب مریض کو ڈاکٹر صاحب یہ مفت کے سیمپل کبھی کبھی مفت ہی میں دے بھی دیتے تھے۔

اچھا یہ بھی خوب ہے کہ یوں تو ڈاکٹر صاحب کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے، میڈیل ریپ جو اتنے گفٹ اور سیمپل لے کر آتے تھے، انہیں بھی بس کھڑے کھڑے ٹال دیتے تھے، لیکن جو کوئی کچھ مانگنے آجاتا، اسے کبھی خالی ہاتھ نہیں موڑتے تھے۔ اور کلینک پہ ایسے لوگوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا۔ اگر سو ڈیڑھ سو مریض آتے تھے تو جو سچ پوچھئے تو بیسیوں ہی لوگ ایسے بھی آجاتے تھے جو کسی نہ کسی بہانے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ کم، کچھ نہ کچھ رقم لے جاتے تھے۔ کوئی زکوٰۃ، خیرات، صدقہ یا مدد کے نام پر مانگتا تو کئی ایسے ہوتے جو قرض کے نام پہ لے جاتے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں گرہ ڈھیلی کرنے میں ایک پل نہ لگاتے۔ نہ ہی انہوں نے کبھی کسی ادھار مانگنے والے کا پتا نشان پوچھا۔ بلکہ مجھے تو خوب معلوم ہے کہ ان ادھار لینے اور کبھی واپس نہ کرنے والوں میں سے کئی تو برابر آتے تھے۔ بڑی ڈھٹائی سے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد۔ لیکن مجال ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پہ کبھی بل پڑا ہو۔ ہاں یہ بھی بڑی خاص بات ہے کہ ان مفت کی کھانے والوں سے ملتے وقت ڈاکٹر صاحب کا رویہ ہی تبدیل ہو جاتا۔ مسکراہٹ تو خیر شاید ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن وہ بڑے دھیان سے ایسے لوگوں کی بات سنتے اور جتنے پیسے وہ مانگتے، بڑی عزت سے ان کو پیش کر دیتے۔ بلکہ مجھے تو صاف لگتا تھا کہ وہ یہ کام رازداری کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ کلینک پہ اتنا رش رہتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا الگ سے کوئی کیبن تھا نہیں۔ بس انکی میز کے بیچوں بیچ ایک پردہ لٹکا ہوا تھا اور دونوں طرف مریضوں کے بنچ تھے۔ ایک طرف عورتیں بیٹھتیں اور دوسری طرف مرد۔ ایسے میں تخلیے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس کالے رنگ کی ایک ڈائری تھی جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ کلینک پہ ہوتے تو ان کی دراز میں پڑی رہتی اور شام کو گھر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔ وہ جب بھی کسی کو پیسے دیتے فوراً ڈائری کھول کر اس میں لکھ لیتے۔ کلینک کے خرچوں اور لین دین کے لئے تو خیر علیحدہ رجسٹر تھے۔ بجلی، گیس اور پانی کے بل، ڈسپنسروں کی تنخواہیں، صفائی والے کے پیسے، کرائے کی رسیدیں، ہفتے کے ہفتے تھوک کے حساب سے آنے والی دواؤں کی ادائیگی۔ ان سب چیزوں کی باقاعدہ الگ الگ فائلیں تھیں۔ لیکن اس کالی ڈائری میں شاید وہ صرف یہی پیسے لکھتے تھے۔ پہلے تو مجھے شک ہی تھا۔ کیونکہ ادھر کسی کو پیسے تھمائے اور ادھر جھٹ سے دراز سے ڈائری نکالی اور اس میں کچھ لکھ لیا۔ لیکن ایک دن جو وہ جلدی میں ڈائری میز کے اوپر ہی چھوڑ کر غسلخانے چلے گئے تو میں نے ہمت کر کے ڈائری کھولی اور صفحے پلٹ کر دیکھ لیا۔ جا بجا مختلف رقمیں لکھی تھیں اور ان کے میزان تھے۔ سب سے آخری صفحے پر آخری تحریر وہی رقم تھی جو انہوں نے ابھی کسی کو دی تھی۔ اس کے اوپر ایسے ہی ادا کی جانے والی باقی رقوم تھیں۔ صفحے کے اوپر آج کی تاریخ لکھی تھی۔ پچھلے صفحے پر بھی کل کی تاریخ میں ایسا ہی حساب تھا۔ آخر میں ٹوٹل لکھا تھا۔ ہر ٹوٹل کے اوپر درست کا نشان کھنچا ہوا تھا۔

گرمیوں کے عروج کے دو تین مہینوں میں تو ڈاکٹر صاحب کے پاس عام دنوں سے بھی زیادہ مریض آتے تھے۔ ایک تو ان دنوں ٹائیفوئڈ، ملیریا، موسمی بخار اور ہیضے وغیرہ کا زور ہوتا اور دوسرے مضافات کے گاؤں سے بہت سے سادہ لوح دیہاتی صرف طاقت کے ٹیکے اور بوتلیں لگوانے کے لئے آتے تھے۔ ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ کلینک پہ کھوے سے کھوا چھل رہا ہوتا۔ یہ فرمائشی ڈرپیں لگوانے والے منہ مانگے دام دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کی بیوقوفی سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ ان دنوں اتنی بوتلیں لگتیں کہ کلینک کا سٹاک اکثر ختم ہو جاتا اور بوتلیں ٹیکے وغیرہ بھی باہر میڈیکل سٹور سے لانا پڑتے۔ پھر بھی باہر کے پیسے چکا کر بھی خاصی بچت ہو جاتی۔ مغرب کے وقت ڈاکٹر صاحب سب پیسے ویسے سمیٹتے، اپنی کالی ڈائری اور باقی رجسٹر اٹھاتے اور گھر روانہ ہو جاتے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ پانچ سو روپے میرے پاس ہی رہ گئے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک مریض سے وصول کئے ہوئے پیسوں میں سے میڈیکل سٹور سے لائی گئی دواؤں کی قیمت ادا کرنے کے بعد پانچ سو روپے بچے تھے۔ وہ میری جیب میں ہی پڑے تھے جب میں کچھ اور کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ یہ رقم جمع کروانی یاد ہی نہ رہی۔ وہ تو گھر جاتے ہوئے موٹر سائیکل کی چابی نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں آ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب کو میرے بتانے سے پہلے اس بات کا پتا چلا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے چور بے ایمان سمجھ لیں، چنانچہ بہتر یہی ہے کہ گھر جانے سے پہلے یہ رقم ان کے حوالے کرتا جاؤں۔

میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا تو شام گہری ہو رہی تھی۔ ان کے ملازم نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی کچھ مصروف ہیں۔ وہ شاید چاہتا تھا کہ میں اس وقت ٹل جاؤں۔ لیکن میرے ذہن پہ بوجھ تھا اور میں یہ پیسے خود ان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ میں معذرت بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ میں انتظار کر لوں گا۔ اس نے مجھے اندر لاؤنج میں بٹھا دیا۔ ان کے گھر میں ویسے بھی ملاقاتیوں کے بٹھانے کے قابل یہی ایک کمرہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ بھی اسی لاؤنج میں کھلتا تھا۔ اندر سے ڈاکٹر صاحب کے باتیں کرنے کی آواز

آرہی تھی۔ وہ کسی سے شاید کوئی بحث کرر ہے تھے۔ لگتا تھا وہ غصے میں ہیں کیونکہ انکی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جارہی تھی۔ وہ واقعی غصے میں تھے۔ لیکن انکا مخاطب یا تو بالکل خاموش تھا یا پھر بہت آہستہ بول رہا تھا۔ پھر تو کچھ دیر میں ڈاکٹر صاحب کی آواز اتنی اونچی ہوگئی کہ ان کے کہے ہوئے جملے کافی کچھ سمجھ میں آنے لگے۔

''بھاڑ میں گئی سالی پارٹنر شپ، میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔۔۔۔بات پہ قائم رہنا آسان نہیں ہوتا بھائی صاحب!۔۔اچھا میری طرف سے کوئی کمی کوتاہی ہوئی ہوتو بتاؤ۔ بولو، جواب دو، اب بولتے کیوں نہیں؟ میں نے انویسٹمنٹ میں کوئی ڈنڈی ماری ہوتو ابھی بتاؤ، میرے منہ پہ۔''

لیکن انکے مخاطب کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

''یہ دیکھو سالا سارا حساب تمہارے سامنے ہے۔ یہ دیکھو، فرق ہے کہ نہیں؟ پورے پانچ سو کا فرق ہے۔''

کبھی کبھی تو وہ تو تڑاخ پہ اتر آتے۔

''معاملہ پچاس روپے کا نہیں ہے، جو میں نے تیرے کہنے پہ لگائے، اپنی جیب سے۔ نہ نہ، بالکل نہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ مجھے پچاس روپے سے فرق پڑتا ہے اور نہ پانچ سو سے۔ لیکن بات ہے اصول کی۔ میں نے پچاس انویسٹ کیئے۔ ریکوری کہاں ہے؟ میرے پانچ سو کہاں گئے؟ نہ بھئی نہ، دس از ان فیئر (this is unfair)، میرے ساتھ چلنا ہے تو سیدھا سیدھا چلو گے، یہ سالی بے اصولی میں برداشت نہیں کرسکتا۔''

میں کچھ خوفزدہ ہوگیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جو بھی جھگڑا چل رہا ہے، اس میں میری جیب میں پڑے ہوئے پانچ سو روپے کا کوئی اہم کردار ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن وہاں سے چلے جانا میرے لئے، وہاں رکنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔

ابھی میں اسی گومگو میں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ سرخ آنکھیں لئے کسی قدر لڑکھڑاتے ہوئے باہر آئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ ''یہ۔۔یہ میرے پاس رہ گیا تھا'' میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

ڈاکٹر صاحب کا نشہ جیسے یکلخت ہی ٹوٹ گیا۔

''اوہ مروادیا'' انہوں نے کہا اور جلدی سے مڑ کر واپس کمرے میں بھاگے۔ وہ دوہراتے جارہے تھے۔ ''سوری، سوری۔۔۔ریئلی ریئلی سوری۔'' وہ مسلسل یہی کہہ رہے تھے۔ انہوں نے جلدی میں دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ان کا بستر تھا اور وسط میں چار کرسیوں کے بیچ بچھی میز پر وہ کالی ڈائری، ایک بوتل، ایک گلاس اور ایک پیالے میں کچھ برف رکھی تھی۔ کمرے میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

 

تاجا

تاجے نے گیارا سکھوں کو مارا تھا۔ اور وہ بھی پاکستان سے انڈیا واپس جا کر۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے لٹے پٹے اور بچے کھچے خاندان کو لے کر یہاں پہنچا تو ٹھکانے اور گزر اوقات کا انتظام ہوتے ہی واپس انڈیا روانہ ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ سنجیدہ اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی وہ تھا، اس نے جانے سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی اور عدت گزرنے کے بعد اس کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کروائی تھی۔ اس نے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ اس کی واپسی کی امید نہ رکھیں۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ بیدیوں کی حویلی کے ہر مرد کو ختم کر دے گا، ان کا بیج مکا دے گا۔ یا پھر اس کوشش میں خود ختم ہو جائیگا۔ بیوی بہت روئی پیٹی، بھائی نے سمجھانے کی کوشش کی، بچ جانے والی بہن پیروں میں پڑ گئی۔ لیکن اسے کون روک سکتا تھا۔ اس نے تو یوں بھی سب سے بڑا قدم پہلے ہی اٹھا لیا تھا۔ گھر والوں کو اپنا پروگرام بتانے سے پہلے ہی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

''بھلیئے لوکے، میں تجھ سے خوش ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن مجھے معاف کر دینا میں تجھے طلاق دے رہا ہوں۔'' اس دن تاجے نے صغری کو بلا کر بتایا۔ وہ بیچاری تو ہکا بکا رہ گئی۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ تاجا اپنے بھائی، بہن اور بچوں کی قبر پہ قسم کھا کے آیا ہے، سکون سے نہیں بیٹھے گا، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس سلسلے کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اسے ہی طلاق ہو جائیگی اور وہ بھی اتنی جلدی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی یا احتجاج کرتی، تاجا اسے تین طلاقیں دے چکا تھا۔

''مجھے ضروری کام سے جانا ہے، بارڈر پار۔ خبر نہیں واپس آتا ہوں کہ نہیں۔'' اس نے بیوی کو بتایا۔ ''تجھے باندھ کے نہیں رکھ سکتا۔''

پھر تاجے نے چھوٹے بھائی کو آواز دی۔ فیاض پہاڑ سے ایندھن لے کر لوٹا تھا۔ ابھی اس کا پسینہ بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ بھائی کی آواز سنتے ہی چلا آیا۔ ''میں نے صغری کو طلاق دے دی ہے۔۔ سن میری بات سن۔۔'' اس نے بھائی کو منہ کھولتے دیکھ کر ڈپٹ کر کہا۔ ''عدت پوری ہوتے ہی تجھ سے بیاہ ہوگا اس کا۔''

''پر لالہ۔۔۔۔''

''پوری بات سن لو دونوں۔'' اس نے فیاض کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ''مجھے کام سے جانا ہے بارڈر پار، ایک ضروری کام ہے مجھے۔''

''او مجھے پتا ہے کون سا ضروری کام ہے تجھے۔'' اس بار فیاض نے تاجے کی بات کاٹ دی۔ صغری اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''چھوڑ دے لالہ، یہ خیال دل سے نکال دے۔'' فیاض نے لجاجت سے کہا۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ہم موڑ کے نہیں لا سکتے انہیں جو

چلے گئے۔اب دھیان دے اس گھر پہ۔ہم دونوں مل کر محنت کریں گے۔اپنا غصہ،اپنا زور،اب سارا ادھر لگا دیں گے۔نیا گھر بنائیں گے۔"

"جھلا نہ بن،میں نے قسم کھائی ہے۔اس بارے میں اب اور کوئی بات نہیں ہوگی۔میں نے صغری کو طلاق دے دی ہے۔میں نہیں چاہتا یہ میری آس پہ بیٹھی رہے۔تو اسے خوش رکھنا۔اگر زندگی رہی تو واپس آؤنگا۔"

اس کے بعد عدت کے چار مہینے ایسے گزرے جیسے گھر میں مرگ ہوگئی ہو۔پھر کوئی مرگ ہوگئی ہو۔ابھی تو پچھلے صدمے ہی نہیں بھولے تھے۔وہ لوگ تاجے کے دو جوان بھائیوں اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی جان اور ایک جوان بہن کی پہلے عزت اور پھر جان گنوا کر یہاں پہنچے تھے۔شکیلہ صرف اس لئے بچ گئی تھی کہ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ مرغیوں کی ٹوکری میں چھپ سکی تھی۔یوں زاہد اور شاہد تو شکیلہ سے بھی چھوٹے تھے لیکن سب کے سب تو ٹوکری میں نہیں سما سکتے تھے۔صغری اور فیاض کو وہ لوگ مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔بیدیوں کا حملہ بڑا زوردار تھا۔لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے لیس حویلی کے سارے ہی مرد آپہنچے تھے۔ملازموں سمیت۔خود تاجا گھر سے باہر تھا۔روانگی کے انتظامات کرنے کے لئے۔اسے بالکل امید نہیں تھی کہ بیدی اسے یا اس کے گھر کو نقصان پہنچائیں گے۔بلکہ اسے تو توقع تھی کہ حویلی والے اس سلسلے میں اس کی پوری مدد کریں گے۔اسے تحفظ فراہم کریں گے۔اس کا اور حویلی کا ایک ڈیڑھ نسل کا ساتھ تھا۔شاید اس سے بھی پرانا۔اس کا باپ بھی حویلی کی زمینوں پہ کام کرتا تھا اور شاید اس سے پہلے اس کا باپ بھی۔اس کا باپ مرا تھا تو حویلی کے سارے مرد جنازے پہ آئے تھے۔سکھ تھے،نماز میں تو شریک نہیں ہوئے لیکن جنازے پہ پہنچے ضرور۔ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔تاجے کی سب سے چھوٹی بہن کو جنم دیتے ہوئے۔اس موقعے پر بھی دائی کا انتظام اور گھی شکر کا بندوبست حویلی والوں نے ہی کیا تھا۔اسے یاد تھا دائی نے جب ننھی شکیلہ کو اس کے باپ کی جھولی میں ڈالا تھا تو ساتھ ہی اس کی ماں کے مرنے کی خبر بھی دی تھی۔

"عورتیں تو موت سرہانے رکھ کر بچے جنتی ہیں۔" سردارنی نے کہا تھا۔

ان باپ بیٹوں نے بھی بیدیوں کی زمینوں کو اپنا پسینہ پلایا تھا۔گاؤں بھر میں ان سے زیادہ محنت کرنے والا اور کوئی نہیں تھا۔سب سے زیادہ فصل انہی کا ٹکڑا اٹھاتا تھا۔ان کے جیسے کڑیل جوان بھی کسی اور گھر میں نہیں تھے۔یوں تو سردار بھی بڑے گبھرو تھے۔لیکن تاجے کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔وہ اپنے گاؤں کا سب سے خوبصورت جوان تھا۔چھ فٹ سے اونچا قد،چوڑے کندھے،سانولا رنگ جو آنکھوں تک پہنچتے پہنچتے گہرا سیاہ ہوگیا تھا،گردن پہ بائیں طرف کالا تل تھا جو شاید اس گھرانے کی پہچان تھی۔خاندان کے ہر چھوٹے بڑے مرد کی گردن پہ یہ تل موجود تھا۔اور بدن ایسا تھا کہ جیسے چھینی ہتھوڑے سے چھیل چھیل کر بنایا گیا ہو۔اس کے کندھوں،بازوؤں اور سینے کی مچھلیاں کرتے میں بھی پھڑکتی نظر آتی تھیں۔گاؤں کی کون ایسی مٹیار تھی جو اسے دیکھنے،اس سے بات کرنے کے بہانے نہ ڈھونڈتی ہو۔لیکن خود تاجا تو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلا تھا۔کسی غیر عورت سے بات کرتے ہوئے اس کی نظریں کبھی زمین سے نہیں اٹھتی تھیں۔اس کے جوہر کھلتے تھے تو کھیت میں،یا پھر کبڈی کے میدان میں۔

کبڈی میں تو ایک بار بیدیوں نے اسے انعام میں بھوری بھینس بھی دی تھی۔ میچ اصل میں گاؤں کا نہیں تھا، بیدیوں کا اپنا تھا۔ مقابلہ دنیا پور کے جاٹوں سے تھا۔ جاٹوں کی ٹیم بہت مضبوط تھی۔ یوں تو بیدیوں کو سارے کھلاڑی اپنے خاندان کے ہی کھلانے تھے لیکن انہوں نے رگھبیر کی جگہ تاجے کو شامل کرلیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ وہ بیمار ہے۔ جاٹوں نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اپنی طاقت اور اپنے کھیل پر بڑا مان تھا۔ یہ مان کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ آس پاس کے چودہ گاؤں میں دھوم تھی ان کی۔ کبھی ایک بھی مقابلہ نہیں ہارے تھے وہ۔

اس دن بڑے سردار نے اسے حویلی بلایا۔ ”تاجے پتر، آج حویلی کی لاج تیرے ہاتھ ہے۔ میرے دس لڑکے کھیل رہے ہیں۔ پر یہ کھوتے ہیں۔ نرے کھوتے۔ جاٹ جیت گئے تو سمجھ پورے گاؤں کا نام نیچا ہوگا۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے بازوؤں کو پکڑا اور کہا۔ ”آج ان کی پکڑ سے کوئی جاٹ نکل نہ پائے۔“

اس دن جاٹوں کا ایک بھی لڑکا واپس لکیر تک نہیں جا سکا تھا۔ خود تاجا تین بار انہیں جھٹک آیا تھا۔ وہ مقابلہ جیتے تو بیدیوں نے اسے کندھوں پہ اٹھالیا تھا۔ بڑے سردار نے اس کا ماتھا چوما اور کہا کہ باڑے سے جو بھینس پسند آئے، لے جائے۔ اس نے منع کیا لیکن سردار بولا۔

”اوئے مور کھا، انعام کو منع نہیں کرتے۔“

وہ بھینس لے کر جا رہا تھا تو اجیت کور نے اسے ڈیوڑھی میں روک لیا۔

”مجھے بھی لے جا ساتھ۔“

اس نے بیبا کی سے کہا۔ وہ پہلے بھی کئی بار آتے جاتے تاجے کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی لیکن آج کبڈی کے میچ میں تاجے کا پسینے میں چمکتا ہوا فولادی پنڈا دیکھ کر تو بالکل ہی آپے سے باہر ہوگئی تھی۔

”یا پھر مجھے بتا دے۔ جہاں کہے گا، جب کہے گا میں آجاؤں گی۔“

”مجھے جانے دے اجیت کور، میرا تیرا ساتھ نہیں ہوسکتا۔“

”پوری زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا تو کچھ گھڑیاں ہی دے دے۔“

اجیت کور نے بھینس کی رسی پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ حویلی کی اکیلی بیٹی تھی۔ دس بھائیوں کی بہن۔ بھرپور انگڑائی جیسی جوانی میں اس کا روپ چھلکا پڑتا تھا۔

”میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اسی حویلی کی دیوار میں نقب لگاؤں جس کا نمک کھاتا ہوں۔ رستہ چھوڑ میرا۔“

تاجے نے جھٹکے سے رسی چھڑائی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی کے پیچھے وسیع صحن کے پار برآمدے میں بڑے سردار نے یہ منظر دیکھا اور جلدی سے پیٹھ موڑ کر گھر کے اندر گھس گیا۔

لیکن اس دن بیدیوں کو جانور بننے سے کوئی بات بھی نہ روک سکی۔ کوئی تعلق، نہ مروت نہ لحاظ۔ فسادات کی لہر اٹھی تو جگہ جگہ

لوگوں نے چولے بدلے اور جگری دوست جانی دشمن بن گئے۔ بارڈر کے دونوں طرف ظلم کی لرزہ خیز داستانیں رقم ہوئیں۔ ایک کے خوف نے دوسرے کی بربریت کو جگایا اور لوٹ مار نے لوٹ مار کو ترغیب دی۔ بے سروسامانی میں اپنے گھر بار چھوڑ کر جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر قتل وغارتگری کی ایسی تحریک ہوئی کہ جیسے وہ دشمن فوج کے بھگوڑے سپاہی ہوں۔

اس دن گھر پہنچنے سے پہلے ہی تاجے کو خبر مل گئی تھی کہ بیدیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ دتے کمہار نے اسے موڑ پر ہی روک لیا تھا۔

''تاجے، میرے ساتھ چل۔ گھر نہ جا۔ ادھر اب کچھ نہیں بچا۔ خالصے کہہ رہے تھے، 'کوئی ماں کا یار گاؤں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ یہیں کاٹ دو سب کو۔''

لیکن وہ گھر گیا۔ اسکی بیوی زندہ تھی۔ ایک بہن بھی بچ گئی تھی اور چھوٹا بھائی سر پہ چوٹ کھا کر بیہوش ہوا تھا تو حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ اس نے خاموشی سے اپنے صحن میں قبریں کھودیں۔ تین بڑی اور دو چھوٹی۔ بھائی کے ساتھ مل کر سب کو دفنایا۔ اور پھر قسم کھائی کہ وہ حویلی والوں کی نسل ختم کر دے گا۔ بیدیوں کے ایک بھی مرد کو جیتا نہیں چھوڑے گا۔ پھر وہ اپنی قسم پوری کرنے نکلا تو صغریٰ، جو پہلے اس کی بیوی تھی اور اب بھابھی، اور شکیلہ کی آنسو بھری نگاہوں اور بھائی کی چھچھی کی بے آواز التجا کے سوا اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی وہ کسی کے روکنے سے کہاں رکتا تھا۔ وہ بیدیوں کے کہنے پہ وہاں نہیں رکا تھا تو یہاں کیسے رک جاتا۔

تقسیم کی خبر نکل گئی تھی لیکن ابھی ہجرت اور فسادات شروع نہیں ہوئے تھے جب بڑے سردار نے تاجے کو ایک دن حویلی میں بلوایا تھا۔

''دیکھ تاجے، تو پاکستان جانا چاہتا ہے تو تیری مرضی ہے۔ پیسہ دھیلا، سواری، ہتھیار جو بھی چاہیئے تجھے مل جائے گا۔ اگر کہتا ہے تو ہمارے جوان تم لوگوں کو بارڈر تک بھی چھوڑ آئیں گے۔ لیکن پتر تجھے یہاں کیا تکلیف ہے۔ تیرے بزرگوں کی قبریں ہیں یہاں۔ یہ دھرتی تیری ماں ہے۔ اس زمیں پہ محنت کی ہے تو نے۔ تو رک جا۔ میں ایک ٹوٹا تیرے نام کر دیتا ہوں۔ تو نہ جا۔''

لیکن وہ نہ رکا۔ نہ تب، نہ اب۔

تاجا جانے کتنے مہینے غائب رہا۔ کوئی خیر خبر تو کیا آتی، اس کی واپسی کا تو انتظار بھی اس کے گھر والوں کے لئے ایک ان مانا اور انجانا سا احساس ہی رہا۔ ایک ایسا احساس جو شام کی چائے کے لئے اکثر صغریٰ سے چولہے پہ پانی کا ایک پیالہ زیادہ رکھوا دیتا، اور رات کو دروازے کے کواڑ بند کرنے سے پہلے فیاض کو گلی کے موڑ تک دیکھنے پر مجبور کر دیتا۔ اس قدر تو ان لوگوں کو ان کی یاد نہیں ستاتی تھی جو مر گئے تھے۔ مار دیے گئے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی تاجے کا تذکرہ نہیں کیا۔ شکیلہ تک نے کبھی لالے کا نام نہیں لیا۔ ان تینوں کے مابین جیسے ایک ان کہا معاہدہ طے پا گیا تھا۔ تاجا کہاں گیا تھا۔ کس کام سے گیا تھا، یہ ان تینوں کا ایک ایسا راز تھا جس میں انہوں نے کبھی کسی کو شامل نہیں کیا تھا۔ کم از کم جان بوجھ کر۔

پھر ایک دن وہ لوٹ آیا۔ اسی خاموشی سے جیسے وہ گیا تھا۔ فیاض رات کو کواڑ بند کرنے گیا تو وہ دہلیز پہ کھڑا تھا۔ فیاض 'اوئے لالہ'

کہہ کراس سے لپٹ گیا۔

''تو آ گیا لالہ؟'' وہ اس کے بازو اور کندھے ٹٹول ٹٹول کر جیسے اس کے مادی وجود کا یقین کر رہا تھا۔

''ہاں میں آ گیا۔ بیدیوں کا بیج ختم کر دیا میں نے۔ نسل مکا دی ان کی۔''

ان چند مہینوں نے تاجے کو کئی برس بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک سنجیدہ اور زیادہ تر خاموش رہنے والا شخص تھا، اب تو اسے بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ صرف ضرورتاً ہی بات کرتا تھا۔ بارڈر پار اس پر کیا گزری، اس نے کیسے ان سکھوں کو قتل کیا، اور کس طرح زندہ بچ کر واپس پہنچ گیا، اس پر اس نے کبھی بات نہیں کی۔ بیٹھک کا تو خیر وہ کبھی بھی شوقین نہیں تھا، اپنے گھر والوں سے بھی اس نے کبھی یہ ذکر نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے بھائی سے پہلے دن جو جملہ کہا تھا، اس کے علاوہ اس کے منہ سے کبھی کچھ نہ نکلا۔

لیکن نہیں معلوم کس طرح بات آہستہ آہستہ گاؤں میں نکل گئی تھی اور آخر کار ہر چھوٹے بڑے کو پتا چل گیا تھا کہ تاجے نے بارڈر پار جا کر گیارہ سکھ مارے ہیں۔ لوگ اس کے سامنے تو بات نہیں کرتے تھے لیکن آپس میں ضرور اس مہم کے تذکرے ہوتے تھے۔ پھر جیسا کہ ہوتا ہے، زبانوں اور کانوں کے ذریعے سفر کرتی اس بات کے گرد بیسیوں کہانیاں گھڑ لی گئیں جو آس پاس کے کئی گاؤں تک جا پہنچی تھیں۔ ان کہانیوں میں سکھوں کے قتل کی ایسی ایسی تفصیلات تھیں جن سے شاید خود تاجا بھی واقف نہ ہو۔ اسے ان کہانیوں کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی مختصر سی دنیا میں مگن تھا۔ واپسی کے کچھ ہی دن بعد وہ گھر چھوڑ کر گاؤں کی مسجد میں منتقل ہو گیا تھا۔ مسجد کا حجرہ خالی پڑا تھا۔ اس نے وہاں ڈیرہ ڈال لیا۔ ایک بار پھر اس کے گھر والے اسے روکنے میں ناکام رہے تھے۔ یوں وہ شام کی چائے اور رات کا کھانا گھر پر ہی کھاتا تھا۔ دوپہر کی روٹی اس کی سابقہ بیوی اور موجودہ بھابھی کھیت میں ہی لے آتی تھی۔ وہ بھائی کے ساتھ حسب سابق کھیت میں کام کرتا تھا اور ایندھن بھی اکٹھا کر کے لاتا تھا لیکن مغرب کے وقت سے مسجد چلا جاتا تھا۔ اس نے پھر شادی بھی نہیں کی۔ بھائی نے کئی بار اس سے کہا بھی۔ یہ بھی کہا کہ اگر وہ چاہے تو فیاض صغریٰ کو طلاق دے دے۔ لیکن اس نے صاف بتا دیا تھا کہ اب وہ شادی نہیں کرے گا۔

اس کی زندگی کے اب دو ہی حصے تھے۔ کھیت اور مسجد۔ وہ جو پہلے کبھی عید بقر عید پر ہی نماز پڑھتا تھا، اب پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مسجد کی صفائی ستھرائی، پانی کا انتظام اور وضو کے کوزوں کی حفاظت، یہ سب کام اس نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔

اسی مختصر سی دنیا میں مگن اسے بیس سال گزر گئے۔ بلکہ اس دوران اس کی مصروفیات اور بھی سکڑ گئی تھیں۔ اب وہ بھائی کے گھر بھی کبھی کبھی جاتا تھا اور کھیت میں تو صرف کٹائی کے دنوں میں مدد کے لئے جاتا تھا۔ اب وہ تاجے کی نسبت بابا نمازی کے نام سے زیادہ پہچانا جاتا تھا۔ یہ نام اسے اس نئی پود نے دیا تھا جو ان بیس سالوں میں پیدا ہو کر جوان ہوئی تھی اور جس نے سفید داڑھی والے اس لمبے تڑنگے آدمی کو جب دیکھا مسجد میں ہی دیکھا تھا۔

وہ جاتی گرمیوں کی ایک رات تھی جب حجرے کے کواڑ کی آواز سے تاجے کی آنکھ کھلی۔ پورے چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا، ایک چادر پوش کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ ضرور مسجد کی دیوار پھاند کر اندر آیا ہوگا کیوں کہ مسجد کا دروازہ تو تاجے نے خود بند کیا تھا۔

''اٹھ اوئے تاجے، تگڑا ہو جا تیری موت آئی ہے۔'' نو وارد للکارا۔

تاجا اٹھ بیٹھا۔ ''کون ہے تو؟''

نو وارد نے منہ سے چادر ہٹائی وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ اس کی سچی داڑھی ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں خون تھا۔

''میں تیری موت ہوں۔ نام ہے میرا بچن سنگھ بیدی۔''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، تاجے نے بجلی کی سی تیزی سے سرہانے سے کٹار نکال کر اس کی گردن پہ رکھ دی۔ اس کی تیز دھار چاندنی میں چمک رہی تھی۔ لیکن پھر تاجے کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ہتھیار نوجوان کی گردن سے ہٹا لیا۔

''اوئے نئیں بیبا۔ بیدیوں کی تو میں نے نسل ہی ختم کر دی تھی۔''

بچن سنگھ کے لئے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے دایاں ہاتھ چادر سے نکالا تو اس میں خنجر تھا۔ تاجے نے خنجر کے وار سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اس نے کوئی مزاحمت کی۔ پہلا ہی وار کاری تھا لیکن نوجوان حملہ آور نے تین بار اور خنجر تاجے کے پیٹ میں گھونپا اور پھر اس کو چارپائی پہ دھکیل کر پلٹ پڑا۔

وہ مسجد کے صحن میں پہنچا تو اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی گردن پہ اس جگہ کو سہلایا جہاں تاجے نے کٹار رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ خون لگ گیا۔ کھلی ہوئی چاندنی میں اس کی گردن پہ کٹار کی دھار سے بننے والی لہو لکیر کھچی ہوئی تھی جس سے ذرا اوپر ایک کالا تل دمک رہا تھا۔




بیٹھک

مجھے صبح سویرے گجرانوالہ کے لئے نکلنا تھا اور محفل کے برخواست ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میزبان بھی میں خود ہی تھا۔ ظہیر انکل اور سرمد کئی مہینوں کے بعد آئے تھے۔ فواد تو سراپا تواضع بنا ہوا تھا۔ وہی دن میں انہیں داتا دربار بھی لے گیا تھا۔ اب مجھے کم از کم رات کی بیٹھک تو بھگتنا ہی تھی۔ یہ نہیں کہ مجھے اس میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ بھلا فواد، سرمد اور ظہیر انکل اکٹھے ہوں اور اس محفل میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا۔ فواد کے ساتھ میری ذہنی ہم آہنگی بے مثال تھی اور اس کی ظرافت اور برجستگی اسے کسی بھی محفل کی جان بنا دیتی تھی۔ میرا اور سرمد کا ذوق بہت سے معاملات میں سانجھا تھا۔ ہم دین، سیاست، تاریخ، ادب اور فن، ہر قسم کے موضوعات پہ بلاتکلف بات کر سکتے تھے۔ ظہیر انکل یوں تو رشتے میں ہم تینوں کے چچا تھے لیکن ان کے ساتھ ہمارے دوستوں کے سے مراسم تھے، ہاں ادب کی ایک خاص حد کے لحاظ کے ساتھ، سرمد جس کے آس پاس ہی رہتا تھا اور جسے وہ کبھی کبھی پار بھی کر جاتا تھا۔

''گجرانوالہ کونسا دور ہے یہاں سے۔'' ظہیر انکل نے کہا۔ ''آدھے گھنٹے کا رستہ ہے ٹوٹل۔ صبح نکلو گھر سے اور کام مکمل کر کے شام سے پہلے پہلے واپس گھر۔''

''صبح نکلنا ہی تو سارا مسئلہ ہے۔'' فواد بولا۔ ''علی کا خیال ہے کہ صبح سویرے کا وقت صرف سونے کے لئے اچھا ہے۔''

''تو آپ دیر سے نکل جائیں۔'' سرمد نے حل پیش کیا۔ ''کتنی دیر کا کام ہے آپ کا؟''

''ہے کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا۔ خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن 'آدھے گھنٹے کے رستے' پہ مجھے ضرور اعتراض ہے۔''

''ہوں۔'' ظہیر انکل نے زور سے سر ہلایا جو کسی اعتراض سے نمٹنے کے لئے ان کی آمادگی کا اظہار تھا۔ ''وہ کیا؟''

''مجھے کئی بار یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ ہم کسی بھی سفر کے دورانئے کو انڈر ایسٹیمیٹ کرتے ہیں۔ گروسلی انڈر ایسٹیمیٹ۔۔۔''

''اگر وہ سفر کسی اور کو درپیش ہو۔'' فواد نے لقمہ دیا۔

''خصوصاً!''

''مطلب یہ کہ لاہور سے گجرانوالہ کا سفر آدھے گھنٹے کا نہیں ہے۔'' ظہیر انکل بولے۔ ''چل دکتور، پونے گھنٹے کا ہوگا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا، پندرہ منٹ اور لے لے۔''

''دو گھنٹے سے ایک منٹ کم نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔ ''اور سر، یہ آپ پر ہی بس نہیں ہے، سب ایسے ہی کرتے ہیں۔ مجھے چونکہ سفر

بھی بہت کرنا پڑتا ہےاوراسی لئے راستے، فاصلے اوران کے وقت بھی معلوم کرنا پڑتے ہیں اس لئے مجھے توسینکڑوں بار یہ تجربہ ہو چکا ہے۔''

''مثلاً!''

''مثلاً ہمیں فیصل آباد میں اطلاع ملی کہ اگلاٹور (tour) حافظ آباد کا ہےاور وہاں سے دودن کی انسپیکشن پنڈی بھٹیاں میں ہے۔رہنا حافظ آباد میں ہے اور وہاں سے روز پنڈی بھٹیاں جانا ہے۔میں نے فون پہ ہی دفتر والوں سے پوچھا، یہ کتنی دور ہے، پنڈی بھٹیاں حافظ آباد سے۔انہوں نے بتایا 25 ,20 کلومیٹر۔جہاں اس وقت ہم بیٹھے تھے،اس ہسپتال کے MS نے تصدیق کی کہ بس اتنا ہی ہے۔زیادہ سے زیادہ تیس کلومیٹر۔حافظ آباد پہنچے تو وہاں جس ہسپتال کی انسپیکشن تھی، وہاں سے پتا چلا کہ 40 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔پھر ہم ریسٹ ہاؤس گئے تو وہاں کے چوکیدار سے بھی پتا کرلیا۔۔''

''احتیاط اچھی ہوتی ہے۔''ظہیرانکل نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''۔۔چوکیدار نے بتایا کہ 45 کلومیٹر ہے۔صبح جب ہم پنڈی بھٹیاں کے لئے نکلے تو مائیل سٹون پہ لکھا تھا۔61 کلومیٹر''

''یہ تو پھرتمہارا اپنا قصور ہے،نہ تم اتنی بار پتا کرتے اور نہ فاصلہ بڑھتا چلا جاتا۔''فواد نے ہنس کرکہا۔

''اورفواد کی بات میں وزن ہے۔''ظہیرانکل نے کہا۔''تمہارے شک نے ہی تمہیں اصل میں تنگ کیا۔تم 20 کلومیٹر کا یقین لے کر نکلتے تو راستہ بھی 20 کلومیٹر کے جیسی آسانی سے طے ہو جاتا۔''

''راستہ تو خیر یہ بھی آسانی سے ہی طے ہوگیا تھا۔''میں نے کہا۔''پھر راجن پور سے جام پور کا 17 کلومیٹر کا بتایا ہوا فاصلہ وہاں پہنچنے پہ 55 کلومیٹر نکلا۔''

''حکیم لقمان کسی درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ایک مسافر نے ان سے پوچھا فلاں شہر کا راستہ کتنی دیر کا ہے۔انہوں نے کہا، ''چل''۔وہ سمجھا بڈھا بددماغ ہے، چل پڑا، چار قدم چلا تھا کہ حکیم لقمان نے آواز دے کر روکا اور بتایا کہ جس رفتار سے تم چل رہے ہو، شام تک ہی پہنچو گے۔''

''میں نے تو حضرت، وقت کی بات ہی نہیں کی۔میری مثال میں تو ساری بات فاصلے کی اور اس سے متعلق لوگوں کے غلط اندازوں اوران غلط اندازوں پہ اعتماد کی ہے۔''

''لیکن دکتور، ہم نے تو شروع سے وقت ہی کی بات کی تھی۔''

''یہ لقمان صاحب کوئی حکیم وغیرہ نہیں تھے۔''سرمد نے گفتگو میں نقب لگائی۔''انہیں اصل میں انکی دانائی اور حکمت جو ہے، اس کی وجہ سے حکیم کہتے ہیں۔''

''لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ حکیم نہ ہوں۔میرا مطلب ہے طب والے۔تاریخ اس سلسلے میں خاموش ہے اور قرآن اس

کی تردید نہیں کرتا۔'' ظہیر انکل نے فوراً مورچہ سنبھالا۔ان کی اور سرمد کی بحث کسی بھی وقت، کسی بھی موقعے پر اور کسی بھی موضوع پر ہو سکتی تھی، گو مذہب اور سیاست اس جدال کے لئے بہترین میدان تھے۔وہ دونوں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کا کوئی امکان ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔اگر ظہیر انکل کے منہ سے نکل گیا کہ آج سردی زیادہ محسوس ہو رہی ہے، تو سرمد یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا کہ آج کا درجہء حرارت کل کی نسبت زیادہ ہے، وہ کہیں گے، 'او بیوقوف، میں نے کہا ہے کہ محسوس ہو رہی ہے، اور تمہیں کون سمجھائے کہ احساس کو آپ حرارت کے درجے سے نہیں ناپ سکتے۔' جس پر وہ کچھ اور کہے گا، اور یہ کچھ اور کہیں گے۔بات موسم سے نکل کر ٹیکنالوجی، جغرافیہ، تاریخ اور پھر جانے کہاں کہاں چلی جائے گی۔آوازیں بلند ہونگی۔ایک دوسرے کا مذاق اڑایا جائیگا۔کتابیں کھلیں گی، حوالے تلاش کئے جائیں گے، اور گھنٹوں گزر جائیں گے۔حاضرین محفل شروع میں مقدور بھر شریک گفتگو ہوں گے، پھر فقط کہیں کہیں گرہیں لگائیں گے۔اس کے بعد صرف تماشائی بن کر رہ جائیں گے اور حاضر جوابی، طنز و تشنیع اور نکتہ آفرینی کے اس مظاہرے سے لطف اندوز ہوں گے اور آخر میں ٹریفک میں پھنسے ہوئے لوگوں کی طرح بور ہونے لگیں گے۔

میں نے ایسی کسی صورتحال کی پیش بندی کے خیال سے جلدی سے پوچھا۔

''ظہیر انکل، یہ ابن الوقت کیا ہوتا ہے؟''

''دکتور، تمہارا سوال کچھ تمہارے پائے کا نہیں ہے۔بھئی معروف تو یہی ہے کہ مصلحت پسند، موقعہ پرست شخص کو جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اصول بدلتا رہتا ہے، ابن الوقت کہتے ہیں۔''

''حضرت، لغت کا سوال ہوتا تو گستاخی معاف، میں آپ سے پوچھتا؟''

''ہوں۔'' ظہیر انکل مسکرائے اور سر ہلا کر لمبا ہنکارہ بھرا۔

''میں تو آپ سے تصوف کی ایک اصطلاح کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ابن الوقت صوفی کسے کہتے ہیں؟''

''آج کل کے، میرا خیال ہے سبھی صوفیوں کو کہہ سکتے ہیں۔'' فواد بیچ میں بول پڑا۔

''جعلی صوفی کو۔'' سرمد نے فواد کا جملہ ختم ہونے سے اور ظہیر انکل کے جواب دینے سے پہلے کہا۔'' جو یا تو خود اس فریب میں مبتلا ہو کہ وہ صوفی ہے یا پھر لوگوں کو یہ دھوکہ دے رہا ہو۔''

''ابن الوقت صوفی کم ظرف ہوتا ہے۔اس سے کرامتیں سرزد ہوتی ہیں۔یعنی اسے اپنی طاقت پر کنٹرول نہیں ہوتا۔وہ اپنا حال دوسروں کو کہہ سناتا ہے، راز فاش کر دیتا ہے۔اس کے مقابلے میں ابوالوقت صوفی کرامات کو قابو میں رکھتا ہے اور اپنا حال ظاہر نہیں ہونے دیتا۔''

''تذکرہء غوثیہ میں ہے نا کہ دو مجذوب کہیں بیٹھے تھے۔لوگوں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون بناوٹی، دونوں کے زانوؤں پہ جلتے ہوئے انگارے رکھ دیے۔۔۔''

''انگارے ہمیشہ جلتے ہوئے ہی ہوتے ہیں۔'' سرمد نے فواد کی بات کاٹی۔

''ایک کی جلد جل گئی۔دوسرا محفوظ رہا۔لوگ تو یہ سمجھے کہ جو نہیں جلا وہ اصلی مجذوب ہے لیکن غوث علی شاہ پانی پتی کا کہنا ہے کہ وہ جو جل گیا رتبے میں بلند تھا، کہ اس نے اپنا حال ظاہر نہیں ہونے دیا۔''

''حال نہیں ظاہر کرنا تھا تو وہاں مجذوب بن کر بیٹھا ہوا کیوں تھا۔'' سرمد نے کہا۔''انجے پکھنڈ بنائے ہوئے نے اینہاں نے۔''

''اصل میں بھائی صاحب نے مثنوی مولانا روم شروع کی ہے۔''فواد نے اطلاع دی۔

''واہ سبحان اللہ۔مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلامے۔۔''ظہیر انکل نے انگلی اٹھا کر سر گھماتے ہوئے دہرایا:

''تا غلامے شمس تبریزی نہ شد۔''

''۔۔اس کے تعارف میں مترجم نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے کچھ اصطلاحات اور مثنوی سے اخذ کئے گئے کچھ concepts کی وضاحت کی ہے۔''

''مولانا روم کی کیا بات ہے؟''ظہیر انکل ابھی تک شعر کے نشے میں تھے۔

''کیا بات ہے مولانا روم کی؟'' سرمد نے تمسخراً دہرایا۔''اچھے بھلے عالم آدمی، درس و تدریس کرتے کرتے ایک نوعمر لڑکے کے عشق میں پاگل ہو گئے اور دین و دنیا سے گئے۔''

''او نالائق!''ظہیر انکل نے رنجیدگی سے کہا۔''استغفار پڑھ گیارہ بار۔'' وہ غلطی کی مناسبت سے استغفار کی مجوزہ تعداد میں کمی بیشی کرتے رہتے تھے۔

''اور اسی پاگل پن نے۔۔یعنی بقول سرمد کے، پاگل پن نے دنیا کو مثنوی دے دی۔''

''یہ بھی غلط ہے۔'' سرمد کب باز آتا تھا۔''ساری مثنوی میں تو مولانا جونسا ہیں، اپنے ایک مرید حسام الدین سے مخاطب رہے ہیں۔''

''اور یہ حسام الدین کے ساتھ بھی مولانا کا تعلق ایک معمہ ہے۔ بظاہر وہ مرید ہیں لیکن مثنوی میں ان کا ذکر ایسے کیا گیا ہے جیسے وہ مولانا کے مرشد ہوں، بلکہ کبھی کبھی تو جیسے جان سے پیارے محبوب ہوں۔'' میں نے کہہ تو دیا لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے گفتگو کا رخ ایک چھوٹی بحث سے بڑی بحث کی طرف موڑ دیا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ شاید میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔

''او دکتور، یہ صوفیانہ رمزیں ہیں۔اور پھر شاعری کی دنیا میں بہت کچھ چل جاتا ہے۔''

''یہ اچھا انداز ہے آپ کا۔'' سرمد نے چڑایا۔''جس چیز کی کوئی دلیل نہ ہو اسے رمز کہہ لو۔''

''یہ تو ہے ہی پاگل۔''ظہیر انکل نے سرمد کی طرف اشارا کیا۔''تم سناؤ کیا پڑھا تم نے، کیا اخذ کیا؟''

''یہ تو ماننا پڑے گا کہ مولانا کا تخیل غضب کا ہے۔خیال سے خیال جوڑتے ہیں اور بات سے بات نکالتے ہیں۔کاش مجھے فارسی اچھی طرح آتی تو میں ان کے کلام کے حسن کا بھی صحیح مزہ اٹھاتا۔۔۔''

''فارسی کے بغیر تو لطف ہی نہیں۔''ظہیر انکل نے گردن ہلا کے کہا۔

''جی ہاں۔ایک آدھ شعر تو میں نے یاد بھی کیا تھا لیکن بھول گیا۔خیر دوسری قابل ذکر چیز ہے۔یا شاید پہلی۔نکتہ آفرینی۔کسی بات پر، قرآن کی کوئی آیت ہو، کوئی حدیث یا پھر کوئی اور روایت۔کوئی جملہ، کوئی لفظ۔ایسے زاویے سے اس پہ نگاہ ڈالیں گے کہ کچھ سے کچھ مطلب نکال کے رکھ دیں گے۔''

''ہمارے دینی زوال کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے۔اپنے کلام کے زور سے، ہمارے بڑے بڑے جونسا ہے بزرگوں نے سیدھی سیدھی باتوں کے ایسے ایسے مطلب نکالے ہیں کہ نبوت تو ایک طرف، خدائی میں بھی شریک ہو گئے ہیں۔''سرمد نے کہا۔

''اُو تو چھوڑ اس کو، مثال پیش کر۔''

''مثال۔؟ کس چیز کی؟''

''رومی کے کلام سے۔۔نکتہ آفرینی کی۔۔۔تم کہہ جو رہے تھے۔''

''ہاں اس وقت جو مجھے یاد آ رہی ہے وہ قرآن کی ان آیات کا ذکر ہے جب حضرت ابراہیم نے مرنے کے بعد جی اٹھنے کے بارے میں اپنے دل کی تسلی کے لئے چار پرندے ذبح کر کے چار پہاڑوں پہ ڈالے تھے۔' رومی کہتا ہے کہ یہ چار پرندے انسان کے نفس کی چار شکلیں ہیں یا اس کے چار روپ ہیں۔مور، مرغ، کوا اور بطخ۔مور جاہ پرستی، جاہ طلبی اور غرور کی علامت ہے۔مرغ شہوت اور lust کی علامت ہے، کوا تمنا کو ظاہر کرتا ہے۔نہ ختم ہونے والی خواہشات کا سلسلہ۔ہمیشہ زندہ رہنے کی طلب۔اور بطخ لالچ کی نشانی ہے۔ان خصلتوں کو ختم کر دو تو یہ پرندے مطیع ہو جائیں گے۔تمہارا نفس تمہارے قابو میں آجائے گا۔''

''ایسی ہی باتیں تو تمہاری اس مائی نے بھی نہیں کی تھیں؟''فواد نے پوچھا۔

''کون سی مائی؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یار وہ بزرگ خاتون جسے تم دیکھنے گئے تھے اور نفس کے حوالے سے انہوں نے بڑی مزیدار گفتگو کی تھی۔''

''اوہ ہاں۔'' مجھے یاد آیا کچھ برس قبل میں ایک ایسی مریضہ کو دیکھنے گیا تھا جن کا اپنا ایک حلقہء ارادت تھا۔ان کے ساتھ ایک دلچسپ مکالمہ ہوا تھا۔

''جناب محترم، ایسی مزے دار اور جونسا ہے، متاثر کن گفتگو اس طرح کے سارے ہی لوگ کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا، سارے ہی لوگ! یعنی مولانا روم اور وہ مائی سب ایک ہی کر دئے تم نے۔''فواد نے بات کو بڑھا وادیا۔

''میں نے کونسا ظلم کر دیا۔ آپ کے ابن عربی تو موسیٰ اور فرعون کو ایک کئے بیٹھے ہیں۔''

''وہ تو فلسفہ ہے۔۔۔''ظہیر انکل نے کہنا چاہا۔

''فلاسفر نہیں سر جی، آپ کے اس سلسلہء تصوف کے لئے ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں ابن عربی صاحب، قطب الاقطاب اور خاتم الاولیاء۔''

''اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے او نالائق، میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا، جسے تم نے اپنی جلد بازی سے ناکام بنا دیا کہ یہ ایک فلسفہ ہے، وحدت الوجود۔''

''اور یہ فلسفہ انہوں نے ہی دیا ہے، کوئی ارسطو یا افلاطون نے نہیں بیان کیا۔''

''لیکن تم اسے سمجھو بھی تو۔''

''ایک بات موٹی سی میری سمجھ میں آتی ہے، سیدھی صاف، کوئی گھمن گھیری نہیں اس میں۔ کوئی بھی فلسفہ قرآن وحدیث سے متصادم ہو یا کوئی عمل شریعت کے منافی ہو، بس مسترد کر دو اسے۔''فواد نے کہا۔

''تو کیا چیز متصادم ہے وحدت الوجود میں قرآن سے؟''

''مجھے نہیں پتا، میں نے ابن عربی کو نہیں پڑھا لیکن اتنا جانتا ہوں، اس دن علی جب عبداللہ بھائی کو ان اپنی مائی جی سے ملوانے لے گیا۔''

''اچھا تو عبداللہ جلبانی صاحب سے بھی ملوایا ہے تم نے دکتور؟''

''اصل میں جلبانی بھائی جب بھی آتے ہیں، ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ کسی سے ملواؤ، کسی اللہ والے سے۔ ویسے تو میں دوست احباب میں سے کسی سے بھی ملوا دیتا ہوں لیکن ان دنوں اماں جی سے ملاقات ابھی ذہن میں تازہ تھی، اماں جی نے کہا بھی تھا کہ ملتے رہنا، بس میں وہیں لے گیا۔ فواد بھی ساتھ ہی تھا۔''

''ہاں بھئی فواد، تم اپنا بیان مکمل کرو۔''ظہیر انکل بات کاٹ تو دیتے تھے لیکن اس چیز کا خیال رکھتے تھے کہ کسی کی بات نامکمل نہ رہ جائے۔''پھر اس کے بعد ہم دکتور سے سنتے ہیں کہ جلبانی صاحب کے کیا تاثرات تھے مائی جی کے بارے میں۔''

''بس جی، اماں جی بڑی خوبصورت گفتگو کر رہی تھیں۔ کیسے انکی اپنے نفس سے ملاقات ہوئی، دوستی ہوئی، کس کس درگاہ پہ وہ گئیں اور ایسی ہی باتیں۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تھے۔ عبداللہ بھائی تو پتا نہیں سانس بھی لے رہے تھے کہ نہیں، سر جھکا ہوا، ہاتھ بندھے ہوئے۔ ادھر عصر کا وقت نکلتا جا رہا تھا۔ مجھے اور علی کو بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے، کبھی گھڑی کو۔ اماں جی کی باتوں میں وقفہ تک نہیں تھا۔ آخر میں نے کہا جی کہ ہمیں مصلا منگوا دیں، ہم یہیں نماز پڑھ لیتے ہیں۔''

''نماز تو ہم نے پڑھ لی، لیکن اماں جی کو یہ جسارت کچھ پسند نہیں آئی۔ کچھ کہا بھی انہوں نے۔ پتا نہیں کچھ ایسا کہ جیسے حضوری

سے نکل کر ٹکریں مار لو۔''

''لیکن جلبانی بھائی نے ان کو خفا کرنا پسند نہیں کیا۔''

زہرا نے کھانا لگا دیا تھا۔ہم میز پہ پہنچے تو فواد نے پھر ایک متواضع میزبان کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔''ظہیر انکل، یہ سنگاپورین رائیس ہیں۔زہرا باجی نے خاص طور پہ آپ کے لئے بنائے ہیں''اور''سرمد یار کباب تو تم نے چکھے ہی نہیں''اور''چنے کی دال کی ڈش میری فرمائش پہ بنی ہے،اسے آپ نے ٹیسٹ ضرور کرنا ہے۔''

''بھئی زہرا خان، بہت تکلف کیا تم نے،اور کھانا تو تم ہمیشہ ہی کمال کا بناتی ہو۔''ظہیر انکل جب کسی سے خوش ہوتے تھے تو اس کے نام کے ساتھ خان کا اضافہ کر دیتے تھے۔یہ ایک قسم کی اعزازی ڈگری تھی۔

''یہ کیا تکلف ہے، کچھ بھی نہیں۔''زہرا نے کہا۔''اتنے عرصے کے بعد تو آئے ہیں آپ۔اور میٹھے میں ظہیر انکل،آپ کی پسند کا گاجر کا حلوہ ہے۔''

''اوہو، پہلے بتاتیں تو کچھ جگہ رکھ لیتے۔''

''جگہ خود بخود بن جائے گی۔''

''پھر جلبانی بھائی نے کیا کہا اس اللہ والی خاتون کے بارے میں؟''سرمد نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ خاص نہیں۔بس مجھے کہا کہ کبھی کبھی مل لیا کرو۔''

''پھر آپ ملے کبھی؟''

''نہیں۔''

''خود جلبانی بھائی کا کہنا ہے کہ وہ جب بھی کہیں جاتے ہیں،اس علاقے کا مجذوب خود آ کر ان سے ملتا ہے۔''

''بیان ذمہ داری سے دے رہے ہو؟''ظہیر انکل نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''اس کا ایک مظاہرہ تو میں نے اور علی بھائی نے اس دن چکوال میں دیکھا بھی تھا۔''سرمد نے کہا۔

''او نالائق، پہلے کیوں نہیں بتایا۔''ظہیر انکل کی دلچسپی بہت بڑھ گئی۔''تفصیل سے بتاؤ،ساری بات۔''

''کوئی ایسی خاص تفصیل نہیں ہے۔ہم انہیں اڈے پہ چھوڑنے گئے تھے۔وہاں وہ جو پاگل سا نہیں بیٹھا رہتا۔وہی جو نسا سردیوں گرمیوں میں بغیر قمیض کے فٹ پاتھ پہ بیٹھا رہتا ہے۔۔''

''ہاں ہاں سمجھ آ گئی،ایک ہی تو ہے وہاں۔''

''بہر حال،اس دن ہم اڈے پہ کھڑے تھے تو اس نے دو چکر لگائے۔علی بھائی نے کہا، یہ تو کبھی اپنی جگہ سے اٹھتا نہیں۔جلبانی

بھائی بولے، مجھ سے ملنے آیا تھا، تمہیں ساتھ دیکھ کر قریب نہیں آیا۔''

''میں نے کہا ہم چلے جاتے ہیں، کہنے لگے، نہیں بس ٹھیک ہے، ہوگئی ملاقات۔''

''ویسے ظہیر انکل ایک زمانہ تھا جب کہیں کسی شہر میں ایک آدھ مجذوب ہوا کرتا تھا۔ اپنے آپ میں گم۔ خود سے باتیں کرتا ہوا۔ بچے اکثر سائیں کہتے تھے ایسے لوگوں کو، اور چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ اب تو اللہ کا ایسا فضل ہوا ہے کہ ایسے ہزاروں سائیں ہر جگہ رلے پھرتے ہیں۔''

''فواد میاں، بات دلیل سے کرنا۔'' ظہیر انکل نے حیران ہو کر فواد کو دیکھا۔

''اس میں دلیل کی کیا ضرورت ہے، میں آپ کو کل ہی دکھا دیتا ہوں۔ سڑکوں پہ، گاڑیوں موٹر سائیکلوں پہ، فٹ پاتھوں پہ چلتے پھرتے، شاپنگ مالز میں۔ ہر جگہ۔ ہر طرح کے لوگ۔ بظاہر سنجیدہ، خوش پوش ادھیڑ عمر کے لوگ، ٹیڈی لڑکے، لڑکیاں، اپنے آس پاس سے بے نیاز، ماحول سے بالکل الگ، اپنے آپ میں گم، ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے، زور زور سے اپنے آپ کی گفتگو میں مصروف۔''

''یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے بھئی؟'' ظہیر انکل نے پوچھا۔

''صحیح کہہ رہا ہے سر، یہ موبائل فون کی برکت ہے۔'' سرمد نے کہا۔ ''کمیونیکیشن کے اس ذریعے نے انسان کو اس کے ماحول سے کاٹ کے رکھ دیا ہے۔''

''وہ علامہ اقبال نے کہا ہے نا کہ، خدا کے بندے تو ہیں ہزار، بنوں میں پھرتے ہیں مارا مار، میں اس کا بندہ بنوں گا جسکو، خدا کے بندوں سے ہوگا پیار۔۔۔''

''اوئے ہوئے ہوئے۔ استغفار پڑھ سات دفعہ۔ یہ تو نے کیا حشر کیا ہے علامہ کے شعر کا۔''

''بس ذرا چھیل چھال کے قافیہ ردیف سیٹ کر دیا ہے۔'' فواد نے شرارت سے مسکرا کے کہا۔ وہ اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی تحریفیں کرتا رہتا تھا، کبھی لفظاً اور کبھی معناً۔

''غالب کے تو اس نے مصرعے ہی کہیں سے کہیں جوڑ دیے ہیں، قویٰ مضمحل ہوگئے غالب، اب کسی بات پر نہیں آتی''

''او نالائق!'' ظہیر انکل نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''غالب کے کلام میں تو آپ کو پتا ہی ہے کئی معنے چھپے ہوتے ہیں۔'' فواد بولا۔

''اور آپ نے وہ نکال کے باہر رکھ دیے۔''

''یار وہ غالب کا ایک شعر تو دیکھو ذرا، دیوان پڑا ہے تمہارے پاس؟''

''شعر بتائیں۔''

''کیا شعر تھا۔۔۔کمال ہے بالکل ہی ذہن سے محو ہو گیا ہے۔'' ظہیر انکل نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایک دو لفظ ہی آ رہے ہوں ذہن میں۔ دیوان غالب کے تو کئی مختلف نسخے ہیں میرے پاس۔''

''نسخوں کی ضرورت ہی نہیں، نیٹ ہر چیز آپ کی فنگر ٹپس پہ لے آیا ہے۔'' فواد نے موبائیل نکالتے ہوئے کہا۔

''لیکن حضرت مان لیں گے نیٹ کی بات؟'' سرمد نے کہا۔ ''اور یہ جو ڈاکٹر صاحب نے اتنے نسخے جمع کئے ہوئے ہیں!''

''یہ تو ایک obsession ہے اور بس۔ ورنہ اب جمع کرنے، keep کرنے کا دور نہیں رہا۔''

''لیکن یہاں تو درازوں میں کیسٹیں اور الماریوں میں کتابیں بھری پڑی ہیں۔ پڑھی ہوئی کتابیں پرانی ہو جاتی ہیں تو جناب نئی خرید لاتے ہیں۔ اچھا پھر انہی گانوں کی سی ڈیز بھی ہیں۔''

''سی ڈیز ہی نہیں، اپنے سسٹم میں بھی وہی پرانے گانے ہزاروں کی تعداد میں سیو (save) کئے ہوئے ہیں۔'' فواد نے کہا۔ بات کا رخ اچانک میری طرف پلٹ گیا تھا۔

''اور فلمیں۔۔۔'' مجھے پتا تھا کہ اب فلموں کا ذکر نا گزیر ہے۔ ''سیزن کے سیزن save کر رکھے ہیں۔''

''یہ صرف possess کرنے کا شوق ہے۔ حرص کہہ لو اسے۔'' فواد نے کہا۔ ''او اللہ کے بندے، اب نیٹ نے آپ کو ان سب فکروں سے آزاد کر دیا ہے۔ ہر چیز آپ کی پہنچ میں ہے۔ اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا۔ اب تو آپ کو رستے وستے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ نقشہ فاصلہ سب کچھ یہی بتائے گا۔''

''لیکن یار، چیز آپ کے پاس بھی تو ہونی چاہیے۔ جب آپ کا جی چاہے، آپ دیکھ لیں، سن لیں، پڑھ لیں۔''

''تو آپ کے پاس ہی ہے نا۔'' فواد نے کہا۔ ''انٹرنیٹ نے آپ کی خاطر اتنی بڑی کلکشن (collection) کر رکھی ہے۔ اور پھر تلاش بھی خود ہی کر دیتا ہے۔ منٹوں، سیکنڈوں میں۔''

''لیکن ہر جگہ تو آپ کنکٹڈ (connected) نہیں ہوتے نا۔''

''تو ہر جگہ آپ کی الماریاں بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوتیں۔'' سرمد نے کہا۔

''اور موبائل فون تو آپ کے پاس ہی ہوتا ہے۔'' فواد نے کہا۔ ''تم مجھے کوئی گانا بتاؤ۔ بلکہ ظہیر انکل آپ بتائیں، کوئی قوالی۔''

''کیوں بھئی ہم گانا نہیں بتا سکتے۔''

''چلیں گانا بتا دیں۔''

''آہاں۔ گانا تو ہم بتا دیں گے لیکن تیرا یہ نیٹ اسے ڈھونڈ نہیں سکے گا۔'' ظہیر انکل نے زور زور سے سر ہلایا۔

''آپ بتائیں تو سہی۔''

''لو بھئی، اس لڑکے نے ہمیں چیلنج کر دیا ہے۔''

''چیلنج تو آپ نے اسے کیا ہے۔'' سرمد نے کہا۔

''اچھا بھئی، پھر سنبھالو۔ رفیع کا گانا ہے، تمہاری آنٹی مرحومہ کو بہت پسند تھا۔ کیا بول تھے۔۔۔''

''بس چھوڑ دیں، میں سمجھ گیا۔'' فواد نے اپنے فون پہ انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہمیں بول کیوں نہیں یاد آ رہے۔''

''اب بوڑھے ہو گئے ہیں آپ۔'' سرمد نے کہا۔ میں بھی دل ہی دل میں وہ گانا یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو سعیدہ آنٹی کو بہت پسند تھا۔ شاید دنیا کی بے ثباتی کا ذکر تھا اس میں۔ اچانک ظہیر انکل نے چٹکی بجائی۔ ''ہاں یاد آیا۔۔۔''

اسی وقت فواد کے موبائیل سے رفیع کی لازوال آواز آنے لگی:

''من رے، تو کاہے نہ دھیر دھرے''

پتا نہیں یہ آواز کا جادو تھا، کوئی پرانی یاد یا پھر چیلنج ہار جانے کا احساس کہ ظہیر انکل بالکل خاموش ہو گئے تھے۔

(ایک طویل تحریر سے اقتباس)



ختم شد

تعارف



نام فاروق احمد عدیل ہے، اور عدیل تخلص نہیں ہے لیکن بیس پچیس سال قبل جب پہلی کہانی لکھی تو عمر ایسی تھی کہ اس کی پیشانی پہ ٹانکنے کے لئے 'عدیل احمد' کی رومانویت پسند آئی اور تب سے یہی قلمی نام ہوا۔ 'اردو'، 'ادبیات'، اور 'معاصر' وغیرہ میں چھپتا رہا۔ ایک کتاب بھی 'جھونکے' کے نام سے بازار میں آئی۔ ہاؤس جاب کے دنوں میں انسان کی بیماری اور دکھ سے پہلی ملاقات ہوئی تو کچھ ٹوٹی پھوٹی شاعری بھی کی لیکن انگلیوں کی پوروں میں بسی بے چینی کا علاج نثر لکھنے سے ہی ممکن ہوا۔ مطالعے کا شوق گھٹی میں تھا۔ اس سلسلے میں مختلف طرز ہائے نگارش سے جان پہچان ہوئی۔۔۔ نظر کہاں کہاں سے گزر گئی۔ دل جہاں ٹھہرا تھا ٹھہرا رہ گیا۔ اچھا لکھنے کی کوشش، میرا خیال ہے کہ اچھا پڑھنے کی خواہش کا منطقی نتیجہ ہے۔ ادب، میرے نزدیک نہ برائے زندگی ہوتا ہے اور نہ برائے ادب۔۔۔ بلکہ برائے ادیب ہوتا ہے۔ لکھنے والے کو لکھ کر جو متکبری خوشی ہوتی ہے، وہ اسی کے لئے لکھتا ہے۔ اپنے مزید تعارف کے لئے میر کے شعر کا سہارا لوں گا:

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی
ہوں تو ناکام، پہ ہوتے ہیں مجھے کام بہت

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 37223584'37232336'37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com